فہرست مضامین

شاہ نامہ کی نظم کے اسباب اور زمانہ

"بڑے کاموں کی ابتدا چھوٹی باتوں سے ہوا کرتی ہے" یہ انگریزی
مثل ہمیں شاہ نامہ کی نظم کے اسباب قلمی کرتے وقت بے اختیار یاد آجاتی
ہے۔ایک اندھیری رات فردوسی کے نیند نہ آنے کے واقعہ کو دیکھو اور
ادھر شاہ نامہ کی چار ضخیم جلدوں کا مع ساٹھ ہزار اشعار کے خیال کرو
جن پر اس نے اپنی عمر کے تیس پینتیس سال صرف کیے۔ شاہ نامہ کی
نظم فارسی زبان اور شاعری کی تاریخ میں ایک نہایت عظیم الشان واقعہ
ہے اتنے بڑے واقعہ کا ایک رات کی کچھ دیر کی بے خوابی سے بادی النظر
میں کوئی تعلق تسلیم نہیں کیا جاسکتا لیکن دعوے سے کہا جاتا ہے کہ یہی
خفیف واقعہ عظیم الشان شاہ نامہ کی تصنیف کا ذمے دار ہے۔

ان واقعات کے بیان کرنے کے لیے ہم کو طوس کے ایک باغ کا
تصوّر کرنا چاہیے جس میں فردوسی بیٹھا ہوا ہے۔ باغ سے ملحق فردوسی کا

مکان ہے جہاں اس کے اہل و عیال ہیں۔ رات نے اپنی چھاؤنی چھادی
ہے اس کا منظر بھیانک اور وحشت ناک ہے اس منظر کو میں فردوسی کے
اپنے الفاظ میں دکھانا چاہتا ہوں۔

"رات نے قیر میں اپنا منہ دھو لیا تھا، فلک پر نہ مریخ و عطارد تھے
نہ زحل، ماہِ نو نے انوکھی وضع کی آرائش پیش کی، ابتداء شب ہی سے
رخصت کی تیاریاں کر لیں اس کی کمر باریک تھی اور تاج سنہری، لاجوردی
ہوا میں گرد کے زنگار پھیل چکے تھے، تاریک شب نے دشت و راغ پر
سیاہ فرش بچھا دیا، واہمہ نے شیاطین جو کالے ناگ کی طرح منہ کھولے
تھے آنکھوں کے رو برو کھڑے کر دیے، ہوا کی سنسناہٹ سے معلوم
ہوتا تھا کہ زنگی کوئلوں کی گرد اُچھال رہا ہے، چمن زار اور جوئبار سے
سیاہی کی موجیں اٹھ رہی تھیں، آسمان ساکت، آفتاب بے دست و پا
اور زمین سیاہ رنگ چادر میں منہ چھپائے سرگرم خواب تھی، دنیا کے
دل پر ہراس غالب، گھڑیالی وقت سے بے خبر، سناٹی اور ہُو کا عالم،
نہ پرندوں کی چیخ اور نہ درندوں کی للکار، اچھی بُری بات سے زمانے
کی زبان پر مُہرِ سکوت، نشیب و فراز اور ان کی ہستیاں مفقود۔"

ایسی اندھیری رات فردوسی تنہا باغ میں سو رہا تھا لیکن کسی نامعلوم
وجہ سے اس کو نیند نہ آئی ہر چند چاہا کہ سو رہے مگر سونا میسّر نہ ہوا جب
وحشت زیادہ غالب ہوئی تو گھبرا کر اس نے اپنی بیوی کو آواز دی جو
باغ سے ملحق مکان میں سو رہی تھی، وہ بیدار ہو کر باغ میں آئی، فردوسی
نے چراغ لانے کی فرمائش کی اس نے حیرت کے لہجے میں پوچھا تم کو
آج رات کیا ہو گیا ہے سو کیوں نہیں جاتے، اتنی رات گئے چراغ

کا کیا ہوگا یہاں اس استفسار کا یہی جواب تھا کہ سو کیسے جاؤں نیند آتی نہیں اگر چراغ لے آؤ تو مہربانی ہوگی۔ الغرض چراغ اور چراغ کے ساتھ کسی قدر میوے اور ایک جامِ شراب بھی لایا گیا۔ کچھ دیر شراب اور موسیقی ساز سے دل بہلایا گیا، اس کے بعد یہ عورت (جو فردوسی کی بیوی معلوم ہوتی ہے کیونکہ شاعر اگرچہ اس کو محبّت کے الفاظ سے عموماً یاد کرتا ہے لیکن ساتھ ہی ایسے الفاظ بھی استعمال کرتا ہے جو اس زمانے میں ایک بیوی کے لیے مخصوص تھے مثلاً مہربان یار، مہربانِ جُفت) ہمارے شاعر سے کہتی ہے کہ اگر تمھاری خوشی ہو تو دفترِ پاستان سے میں تم کو ایک ایسی داستان سناؤں جو رزم بزم فریب اور محبت کے واقعات پر مشتمل اور سنجیدہ اور خرد مند لوگوں کے ذکر سے مملؤ ہے اور جس کے سننے سے تم کو آسمان کی نیرنگیوں پر حیرت ہوگی۔ فردوسی نے اصرار سے کہا کہ اے ماہرو آج رات یہ داستان تم ضرور سناؤ اس سے میری پریشان طبیعت کو سکون حاصل ہوگا۔ بیوی نے کہا میں یہ داستان سنانے کے لیے تیار ہوں مگر تم اقرار کر لو کہ سننے کے بعد اس کو نظم کردوں گا۔ فردوسی نے جواب میں کہا مجھ کو منظور ہے۔ یہ قصہ جس طرح ئیں تم سے سنوں گا اسی طرح اس کو نظم کردوں گا۔ اے نیکی شناس مہربان جفت ئیں تمھارے اس خیال دلانے کا خدا کی جناب میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ فکرِ شعر میں مجھ کو مزے سے نیند بھی آجائے گی۔

ان مبادیات کے بعد یہ داستان سنائی گئی یہ خوش قسمت داستان جو اُس رات فردوسی نے اپنی بیوی کی زبان سے سنی داستان بیژن تھی، اس کے واقعات کا تار و پود کچھ اس قسم کا ہے جو ایک عورت کی

پسند لازماً اپنی طرف مائل کرتا ہے۔ کیونکہ جنسِ لطیف کی تحسین تسخیر کرنے
کے تمام عناصر اس میں موجود ہیں۔

نوجوان بیژن جس کے چہرے پر ابھی اچھی طرح خط بھی نکلنے نہیں
پایا ہے کیخسرو کے دربار سے بیڑہ اٹھا کر دشتِ ارمان (ارمن) میں جنگلی
سوروں کے نیست کرنے کے لیے رخصت ہوتا ہے، اس کے ساتھ گرگین
جیسا دغا باز اور کینہ پرور رفیقِ سفر کر دیا جاتا ہے، بیژن اس مہم میں کامیاب
ہو کر سوروں کی دراتنیاں جمع کر لیتا ہے تو گرگین کو اس پر حسد آتا ہے کہ
یہ طفل دربار میں سرخرو ہو گا اور میں کورا رہ جاؤں گا۔ چنانچہ وہ بیژن
کی شہرت خاک میں ملانے کے لیے فریب کا جال گانٹھتا ہے اور اس
سے کہتا ہے کہ یہاں سے ایک دو روز کے فاصلے پر ایک خوشنما مرغزار
ہے جہاں تورانی لڑکیاں اکثر موسم بہار میں بغرض تفریح آتی اور دنوں
تک رہتی ہیں۔ افراسیاب کی بیٹی خوبصورت منیژہ بھی ہر سال آیا جایا
کرتی ہے آج کل بہار کا موسم ہے اور تورانی عورتوں کی آمد کا زمانہ تمھیں
منظور ہو تو ہم تم چل کر کچھ عورتیں پکڑ لائیں اور ایران لے چلیں، اس
میں ہماری ناموری ہو گی۔ سادہ لوح بیژن اس دام میں پھنس جاتا ہے۔
کائیاں گرگین ایرانی سرحد پر جا کر ٹھہر جاتا ہے اور بیژن تن تنہا تورانی
علاقہ میں گھس جاتا ہے، وہ بہت جلد ایک چشمہ سار پر پہنچ جاتا ہے اور
تمام جنگل کو پری زادوں کا اکھاڑا پاتا ہے۔ منیژہ ہمارے پہلوان کو اتفاقیہ
دیکھ کر فریفتہ ہو جاتی ہے اور دایہ کی معرفت بیژن کو خیمے میں بلوا لیا
جاتا ہے۔ چونکہ شہزادی بالکل مفتون ہو چکی تھی اس لیے مفارقت
کی تاب نہ لا کر جاتے وقت بیژن کو بیہوش کر کے اپنے ساتھ عماری

میں لِٹا کر توران لے جاتی ہے اور اپنے باپ افراسیاب کے محل میں کئی روز تک خفیہ رکھتی ہے۔ شدہ شدہ یہ خبر افراسیاب تک پہنچ جاتی ہے اور وہ گرسیوز کی معرفت بیژن کو گرفتار کرا کر پیران ویسہ کی سفارش پر قتل سے باز آ کر ایک کنوئیں میں قید کر دیتا ہے۔ منیژہ کی جائداد ضبط اور محل لُٹا دیا جاتا ہے اور فقیرانہ لباس میں شاہی قصر سے نکال دی جاتی ہے۔ اب شہزادی اپنی اوقات گداگری کر کے بسر کرتی ہے وہ اسی کنوئیں پر رہتی ہے جس میں بدنصیب بیژن قید ہے اور وہی روٹی جو در در بھیک مانگ کر لاتی ہے اس سے اپنا اور قیدی کا پیٹ پالتی ہے۔ گرگین ایران میں واپسی کے بعد بیژن کی غیر موجودگی کا کوئی معقول عذر بیان نہیں کرتا اس لیے قید کر لیا جاتا ہے اور کیخسرو جامِ جہاں نما کے ذریعے بیژن کی قید کے حالات سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔ گیو بیژن کا باپ رستم کی طلبی کو نیمروز جاتا ہے رُستم ایران آکر سات پہلوانوں کو ہمراہ لے کر تاجرانہ بھیس میں توران مع گرگین بغرض رہائی بیژن پہنچتا ہے۔ منیژہ اپنی رسائی رستم تک کر لیتی ہے۔ رستم اس کی معرفت بیژن کے لیے کھانا جس میں اپنی انگشتری چھپا دیتا ہے بھیجتا ہے۔ بیژن اس انگوٹھی کو پہچان کر سمجھ لیتا ہے کہ رستم اس کے چھڑانے کے لیے آگیا اور منیژہ سے راز فاش نہ کرنے کی قسم لے کر رستم کی آمد سے اس کو آگاہ کر دیتا ہے۔ رستم منیژہ کی نشان دہی کے بعد ایک شب اس کنوئیں پر پہنچ کر بیژن کو کنوئیں سے نکال لیتا ہے اب رستم اپنا تاجرانہ لباس اُتار کر اصلی شکل میں پہلوانوں سمیت افراسیاب کے محل میں گھُس جاتا ہے۔ شاہ افراسیاب رستم کی آواز پہچان کر بھاگ جاتا ہے۔ شاہی محل ایرانی

پہلوان لوٹ لیتے ہیں اور ایران کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ دوسرے روز ان کے تعاقب میں افراسیاب لشکر لے کر آپہنچتا ہے۔ سخت معرکے کے بعد جس میں رُستم ظفریاب ہوتا ہے افراسیاب لوٹ جاتا ہے اور رستم مع بیژن و منیژہ ایران پہنچ جاتا ہے۔

فردوسی نے اس داستان کو جو بسبیلِ اختصار اوپر درج ہوئی ہے اپنی بیوی کی فرمائش پر نظم کا لباس پہنا دیا۔ یہاں میں اُس تمہید کے درج کرنے کا بھی موقع فروگزاشت نہیں کرنا چاہتا جو اس داستان کے زیبِ عنوان ہے۔ وہو ہذا۔

ستایش کنم ایزدِ پاک را — کہ گویا و بینا کند خاک را

بمورے دہد مالشِ نرّہ شیر — کند پشّہ بر پیل جنگی دلیر

شبے چوں شبہ روئے شستہ بقیر — نہ بہرام پیدا نہ کیواں نہ تیر

دگرگونہ آرایشے کردہ ماہ — بسیچ گزر کردہ بر پیش گاہ

شدہ تیرہ اندر سرائے درنگ — میان کردہ باریک و دل کردہ تنگ

ز تاجش سہ بہرہ شدہ لاجورد — سپردہ ہوا را بزنگار گرد

سیاہِ شب تیرہ بر دشت و راغ — یکے فرش افگندہ چون پرِّ زاغ

چو پولاد زنگار خوردہ سپہر — تو گفتی بقیر اندر اندودہ چہر

نمودم ز ہر سو سیہ اہرمن — چو مارِ سیہ باز کردہ دہن

ہر آنگہ کہ بر زد یکے باد سرد — چو زنگی بر انگیخت ز انگشت گرد

چناں گشت باغ و لب جوئبار — کجا موج خیزد ز دریائے قار

فروماندہ گردونِ گردان زجاے — شدہ سست خورشید را دست و پاے

زمین زیر آنچا در قیر گون — تو گفتی شدستی بخواب اندرون

جهان را دل از خویشتن پرهراس   جرس برگرفته نگهبان پاس

نه آوای مرغ و نه هرّای دد   زمانه زبان بسته از نیک و بد

نه بد هیچ پیدا نشیب و فراز   دلم تنگ شد زان درنگ دراز

بدان تنگی اندر بجستم ز جای   یکی مهربان بودم اندر سرای

خروشیدم و خواستم زو چراغ   درآمد بتِ مهربانم بباغ

مرا گفت شمعت چه باید همی   شبِ تیره خوابت نیاید همی

بدو گفتم ای بت نیم مرد خواب   بیاور یکی شمع چون آفتاب

بنه پیشم و بزم را ساز کن   بچنگ آر چنگ و می آغاز کن

برفت آن بتِ مهربانم زباغ   بیاورد رخشنده شمع و چراغ

می آورد و نار و ترنج و بهی   زدوده یکی جام شاهنشهی

گهی می گسارید و گه چنگ ساخت   تو گفتی که هاروت نیرنگ ساخت

دلم بر همه کار پیروز کرد   شب تیره هم چون گه روز کرد

مرا مهربان یار بشنو چه گفت   ازان پس که گشتیم با جام جفت

مرا گفت آن ماه خورشید چهر   که از جانِ تو شاد بادا سپهر

بپیمای تا من یکی داستان   ز دفتر برت خوانم از باستان

پر از چاره و مهر و نیرنگ و جنگ   همه از در مردِ فرهنگ و سنگ

بدان سرو بن گفتم ای ماهروی   مرا امشب این داستان بازگوی

مرا گفت گر زمن سخن بشنوی   به شعر آری از دفتر پهلوی

به گفتم بیار ای مه خوب چهر   بخوان داستان و بیفزای مهر

نگر طبع شوریده بخشایدم   شبِ تیره ز اندیشه خواب آیدم

ز تو طبع من گردد آراسته   ایا مهربان یار پیراسته

چنان چون ز تو بشنوم در بدر — بشعر آورم داستان سر بسر
بگویم پذیرم ز یزدان سپاس — ایا مہربان جفت نیکی شناس
بخواند آن بتِ مہربان داستان — ز دفتر نوشتہ گہِ باستان
بگفتار شعرم کنون گوش دار — خرد یاد دار و بدل ہوش دار

اس تمہید کو غور سے پڑھنے کے بعد ہم یہ رائے قایم کرتے ہیں کہ فردوسی نے سب سے پیشتر داستانِ بیژن نظم کی تھی نیز یہ کہ وہ شاہ نامہ کی نظم کا پختہ فیصلہ کرنے سے چند سال قبل اس داستان کو نظم اور شائع کر چکا تھا بلکہ داستانِ بیژن کی عام قبولیت اور شہرت تمام شاہ نامہ کی تصنیف کی اصلی اور قدیمی محرک ہی۔ پیشتر اس کے کہ ہم اپنے دعوے کی تائید کے لیے شہادت اور براہین پیش کریں مناسب معلوم ہوتا ہی کہ چند الفاظ دفترِ باستان اور داستانِ بیژن کے تعلقات کی بابت کہے جائیں۔

دفترِ باستان یا نامۂ خسرواں یا دفترِ پہلوی بروئے شاہ نامہ ایک کتاب کا نام ہی جو فردوسی کے زمانے سے دو ہزار سال قبل تصنیف ہو چکی تھی وہ شاہان ایران کی تاریخ تھی بعد میں اصلی نسخہ غائب ہو گیا لیکن اس کے اجزا جن میں علیحدہ علیحدہ داستانیں پائی جاتی تھیں موبدوں کے پاس ملتے رہے یہ اجزائے پریشان ابو منصور عبدالرزاق کے حکم سے سنہ ۳۴۶ھ میں بادارت ابو منصور المعمری دوبارہ تدوین کیے گئے۔ یہ تیار شدہ نسخہ شاہ نامہ کا غالباً اصلی ماخذ ہی اگرچہ بعض واقعات فردوسی نے دیگر ذرائع سے بھی نقل کیے ہیں داستان بیژن بھی اسی نامۂ خسروان یا دفترِ پہلوی کی ایک کڑی ہی جس کا ماخذ یہی کتاب ہی یہاں مجھ کو اس مغالطے کا بھی ذکر کر دینا چاہیے جو علامہ شبلی کو ہو گیا ہی وہ فرماتے ہیں کہ

داستان بیژن کے واقعات فردوسی کو اس کی ایک منظورِ نظر نے مہیّا کیے تھے حالانکہ فردوسی اس موقع پر صاف صاف کہتا ہے ؎

بخواند آں بُتِ مہربان داستان　　ز دفتر نوشتہ گہِ باستان

وہ کہانی اس نے اس قدیم کتاب سے پڑھ کر سنائی۔

ان مراتب کے بعد داستان بیژن کو شاہ نامہ کی اوّلین نظم ملنے جانے کے بارے میں ذیل کے امور ناظرین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی اس خاص رات تک داستانِ بیژن اور دفترِ باستان سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتا تھا کیونکہ جس اشتیاق سے وہ اس قصّے کے سننے پر آمادگی ظاہر کرتا ہے اس سے یہی عقیدہ مترتب ہوتا ہے نیز قصّے کے ذکر کے وقت فردوسی کی بیوی اس کے بعض خط و خال بیان کرتی ہے چنانچہ ؎

بہ پیمائے تا من یکے داستان　　ز دفتر برت خوانم از باستان

پر از چارہ و مہر و نیرنگ و جنگ　　ہمہ از در مرد فرہنگ و سنگ

کہ چون گوش از گفت من یافت برخ　　شگفت اندرو مانی از کار چرخ

(۲) فردوسی اگر اس وقت شاہ نامہ کی نظم پر مصروف تھا تو ضرور تھا کہ اس داستان سے واقف ہوتا اگر واقف تھا تو دوبارہ سننے کی ضرورت نہیں تھی اور جب اس کی بیوی کو علم تھا کہ وہ شاہ نامہ ہی پر کام کر رہا ہے تو اس داستان کے نظم کرنے کی فرمائش نہ کرتی کیونکہ اپنے وقت پر اس داستان کی بھی باری آجاتی۔

(۳) داستانوں کی نظم کے اسباب فردوسی عام طور پر بیان نہیں کیا کرتا اگرچہ ان کا ماخذ یا راوی وہ اکثر بتا جاتا ہے۔ چونکہ اس نظم کے وقت

واقعات غیر معمولی تھے اس لیے تاریخی دلچسپی کے لحاظ سے تمہید میں انھیں بالتفصیل ذکر کر دیا۔

(۴) فردوسی کا سکہ بحیثیت رزم نگار ہمارے قلوب پر شاہ نامہ کی وجہ سے جما ہوا ہے اس صنفِ سخن میں شاہ نامہ کے سوا کوئی اور تصنیف اس کی طرف منسوب بھی نہیں کی جاتی پھر وہ کیا مخفی وجوہ تھے جن کی بنا پر شاہ نامہ کی نظم کا مستقل ارادہ کرنے سے ایک عرصہ پیشتر اس کے معاصرین میں فردوسی کی رزمیہ شاعری کی شہرت قایم ہو چکی تھی جس کی صدائے بازگشت ہم دیباچے میں دیکھتے ہیں جہاں فردوسی کا ایک دوست اس کے ارادہ کو مستقل اور عزم کو مستحکم کرنے کی غرض سے کہتا ہے ؎

سخن گفتن پہلوانیت ہست | کشادہ زبان و جوانیت ہست

تو جوان ہے اور زبان میں روانی ہے۔ رزمیہ نظم کہنے کا ڈھب تجھ کو آتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ شہرت فردوسی نے داستان بیژن کی بدولت پیدا کی تھی جو اس زمانے سے بہت پیشتر شایع ہو چکی تھی۔

(۵) تمہید کی ابتدا میں حمد کے اشعار کا یہی مفہوم ہو سکتا ہے کہ داستان بیژن علیحدہ لکھی گئی تھی۔

(۶) اگر داستانِ بیژن اور داستانوں کے بعد اپنی ترتیب اور وقت پر لکھی جاتی تو گزشتہ ربط کی یاد دہانی کی غرض سے فردوسی یہ تمہیدی ابیات ہرگز نہ لکھتا ؎

چو کیخسرو آمد بکین خواستن | جہاں ساز نو خواست آراستن
ز توران زمین گم شد آن تخت و گاہ | بر آمد بخورشید بر تخت شاہ
بہ پیوست باشاہ ایران سپہر | بر آزادگان بر بگسترد مہر

گزشتہ داستانوں میں ہم کیخسرو اور افراسیاب کے تعلقات سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں اشعار بالا میں ان تعلقات کی یاد دہانی محض تحصیلِ حاصل معلوم ہوتی ہے۔

(۷) فردوسی کا عام قاعدہ ہے کہ خطوں کی ابتدا میں حمدیہ ابیات ضرور لایا کرتا ہے داستان ہائے ماقبل بیژن نامہ سے چند خط بیان کیے جاتے ہیں۔
(۱) نامۂ منوچہر نزد فریدوں (۲) نامۂ منوچہر باسر سلم (۳) نامۂ زال بہ سام (۴) نامۂ سام نزد منوچہر (۵) نامۂ رستم بزال در پیروزی کوہ سپند (۶) پاسخ نامۂ رستم از زال (۷) نامۂ پشنگ بکیقباد (۸) نامۂ کاؤس بشاہ مازندران بدستِ رستم (۹) نامۂ کاؤس بشاہ مازندران (۱۰) نامۂ رستم بہ شاہ ہاماوران (۱۱) نامۂ سیاوش بکاؤس بدستِ رستم (۱۲) پاسخ نامۂ سیاوش (۱۳) نامۂ افراسیاب بسیاوش (۱۴) نامۂ سیاوش بافراسیاب (۱۵) نامۂ رستم نزد کیخسرو (۱۶) پاسخ نامۂ رستم از کیخسرو۔

یہ تمام خط جو داستان بیژن سے پیشتر شاہ نامہ میں ملتے ہیں حمدِ الٰہی کے اشعار سے مزین ہیں۔ داستان بیژن میں بھی کیخسرو ایک لمبا چوڑا خط بیژن کے بارے میں رستم کو لکھتا ہے۔ لیکن حمد کا ایک شعر بھی اس کے شروع میں نہیں ملتا اس کی وجہ یہی ہے کہ اس وقت تک فردوسی اپنا انداز خاص قایم نہیں کر چکا تھا۔

(۸) فردوسی اختصار پسندی کے لیے مشہور ہے اور یہ اس کی نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ شعرائے متاخرین کی طرح اپنے مضمون کو طوالت دینا پسند نہیں کرتا۔ جس کے وجوہ یہ ہیں کہ اس نے پچاس اڑتالیس برس کی عمر میں شاہ نامہ پر ہاتھ اٹھایا جب کہ اس کی عمر کا بہترین زمانہ گزر چکا

تھا۔موت اور بڑھاپا سر پر کھڑے تھے۔ادھر شاہ نامہ کوئی چھوٹی سی چیز نہیں تھی وہ بجائے خود ایک عمر کا کام تھا۔ نیز فردوسی اپنی وفات سے پیشتر اس کے ختم کرنے کا متمنی تھا۔اندریں حالات بس یہی ممکن تھا کہ غیر ضروری شاعری لفاظی اور زبان آرائی کو بالائے طاق رکھ کر نفس مطلب سے تعلق رکھے اور جہاں تک ہو سکے مختصر لکھے۔اس طرح یہ اختصار پسندی اس کے عام مذاق کا ایک نمایاں جوہر ہو گئی جو شاہ نامہ میں مِن اوّلہٖ اِلیٰ آخرہ مشاہدہ کی جاتی ہے۔لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ داستان بیژن میں ہمارا شاعر خلاف معمول بعض موقعوں پر بلا ضرورت چادر سے باہر پاؤں پھیلا رہا ہے۔ دور کیوں جایئے تمہید کے ان اشعار کو دیکھیے جن میں شاعر نے رات کا منظر دکھایا ہے یہ طرزِ ادا جامی یا نظامی کی معلوم ہوتی ہے نہ فردوسی کی جس کے لیے پندرہ شعر رات کا سماں بیان کرنے میں صرف کیے جائیں۔ یہ ابیات اس شعر سے شروع ہوتے ہیں:

شبے چوں شبہ روئے شستہ بقیر — نہ بہرام پیدا نہ کیوان نہ تیر

فردوسی کے زمانے میں یہ اشعار اس کی شاعری کا بہترین نمونہ مانے گئے ہیں۔ فردوسی کا اوّلین مقلد اسدی دل کھول کر ان کا جواب لکھتا ہے میں ابتدا کا شعر یہاں لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں۔

شبے مہد چو زنگی سیہ تر ز زاغ — نہ نو چو در دست زنگی چراغ

فردوسی اسی طرح کیخسرو کے دربار کی کیفیت بیان کرنے میں خلاف توقع زبان آرائی سے کام لے رہا ہے وہو ہذا۔

بہ بگماز یک روز بنشست شاد — ز گردان لشکر ہمی کرد یاد

بدیبا بیاراستہ گاہِ شاہ — نہادہ بسر برز گوہر کلاہ

یکے جامِ یاقوت پر می بچنگ | دل و گوش دادہ بآوائے چنگ
بزرگاں نشستہ برامش بہم | فریبرزِ کاؤس باگستہم
چو گودرز کشواد و فرہاد و گیو | چو گرگین میلاد و شاپور نیو
شہ نوذران طوس لشکر شکن | چو خرّاد و چون بیژنِ رزم زن
ہمہ بادۂ خسروانی بدست | ہمہ پہلوانانِ خسرو پرست
مے اندر قدح چون عقیقِ یمن | بہ پیش اندرون دستۂ نارون
پری چہرگان پیش خسرو بپاے | سرِ زلف شان بر سمن مشکسائے
ہمہ بزم گہ پُر ز رنگ و نگار | کمر بستہ در پیش سالار بار
ز پردہ در آمد یکے پردہ دار | بہ نزدیکِ سالارِ شہ ہوشیار
کہ بر در بیایند ارمانیان | سپر مرز ایران و تورانیان
ہمی راہ جویند نزدیکِ شاہ | ز راہِ دراز آمدہ داد خواہ
چو سالار ہشیار بشنید تفت | بدرگاہِ خسرو خرامید و رفت
بہ گفت آنچہ بشنید و فرماں گزید | بہ پیش اندر آورد شان چون سزید

یہی طوالت کا ڈھنگ ہم کیخسرو کے اس خط میں دیکھتے ہیں جو رستم کے نام گیو کی معرفت بھیجا گیا ہے اس خط میں چودہ شعر رستم کی تعریف میں لکھے گئے ہیں، اس قدر خوشامد اور تکلف کا کیخسرو کی طرف سے اظہار بیژن کی رہائی کے باب میں جو رستم کا نواسا بھی ہوتا ہے ہمارے خیال میں شاہانہ متانت اور وقار کا خیال کرتے ہوئے بے موقع معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میں اب وہ اشعار نقل کرتا ہوں سہ

کہ ای پہلوان زادۂ پُر ہنر | ز گردان گیہان برآوردہ سر
توئی از نیاگاں مرا یادگار | ہمیشہ کمر بستۂ کارزار

ترا داد گردن بردی پلنگ — بدریا خروشان زہیبت نہنگ
دلِ شہریاران وپشتِ گیان — بفریاد ہرکس کمر برمیان
جہان راز دیوان ماژندران — برستی و کندی بد انزاسران
چہ مایہ سرِ تاجداران زگاہ — رلبودی و برکندی ازپیش گاہ
بسا دشمنان کزتو بیجان شدہ — بسابوم و برکز تو ویران شدہ
سرِ پہلوانان ولشکر پناہ — بہ نزدیکِ شاہان ترادست گاہ
ہمہ جادوان راشکستی بگرز — بیفروختی تاج شاہان ببرز
چہ افراسیاب وچہ خاقان چین — نبشتہ ہمہ نامِ تو بر نگین
ہرآن بند کز دستِ تو بستہ شد — کشایندگان را جگر خستہ شد
کشایندۂ بندبستہ توئی — گیاں را سپہرِ خجستہ توئی
ترا ایزد ایں زورِ پیلان کہ داد — بروبازوو چنگ فرخ نژاد
بدان داد تادست فریادخواہ — بہ گیری برآری زتاریک چاہ
کنون این یکے کار شایستہ پیش — فراز آمدہ است این بشایستہ خویش

اسی طول کلامی کی ایک مثال ہم رستم کی دُعایں پاتے ہیں جو دربار میں پہنچ کر رستم کیخسرو کے حق میں مانگتا ہے اس قسم کی دُعا شاہ نامہ بھر میں اپنی آپ نظیر ہے - چنانچہ :-

ستایش کنان پیشِ خسرو رسید — کہ مہرو ستایش مراو را سزید
برآورد سر آفرین کرد و گفت — کہ بادی ہمہ سالہ با تخت جفت
کہ ہرمزد یادت بدین پایگاہ — بہ جو بہمن نگہ دار تخت و کلاہ
ہمہ سالہ اردی بہشتت ہژیر — نگہبان تو باد بہرام و تیر
زشہریر بادی تو پیروزگر — بنامِ بزرگی و فرّو ہنر

تر ا باد فرخ نیا و نژاد | ز خور داد باد ا بر و بوم شاد
از آذرت رخشنده شب ہمچو روز | تو شادان و تاج تو گیتی فروز
سفندار مذ پاسبان تو باد | خرد جان روشن روانِ تو باد
دی و اور مزدت خجستہ بواد | در ہر بدی بر تو بستہ بواد
وز آبانت ہم کار فرخندہ باد | سپہر روان پیش تو بندہ باد
تن چار پا یانت مرداد باد | ہمیشہ تن و بخت تو شاد باد
چو این آفرین کرد رستم بپاے | شہنشہ بدادش بر خویش جاے

داستان اکوان دیو میں بھی جو داستان بیژن سے مقدم داستان ہے کیخسرو رستم کو نامہ بھیج کر بلاتا نظر آتا ہے یہاں قاصد گرگین میلاد ہے اور رستم حسب الطلب شاہی دربار میں حاضر ہوتا ہے یہاں یہ تمام واقعات چند اشعار میں ختم ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ میرا مضمون اس قسم کی مثالوں سے دراز ہو جائے گا لیکن میں اپنی حجت کی صحت اور صفائی ناظرین سے اس وقت تک تسلیم نہیں کرا سکتا جب تک کہ میں ان کو فردوسی کے دونوں انداز علیحدہ علیحدہ مثالوں کے ذریعے سے نہ سمجھا دوں :-

برون رفت گرگین چو باد دمان | و یا ہمچو گور یکہ ترسد ز جان
چو آمد بزابل برِ نامدار | بدو داد آن نامۂ شہر یار
تہمتن چو بشنید فرمان شاہ | گرازان بیامد بدان بارگاہ
ببوسید خاک از برِ تخت اوی | ہمہ آفرین خواند بر بخت اوی
چنین گفت شاہا مرا خواستی | کنون آمدم تا چہ آراستی

اسی طرح ایک اور موقع پر جب کہ ایرانی افواج تورانیوں سے ہزیمت

پا کر کوہ ہماون پر محصور ہو جاتی ہیں، ان کی اعانت کی غرض سے کیخسرو رستم کو زابلستان سے بلواتا ہے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر رستم کی طلبی اور دربار میں حاضری وغیرہ کے واقعات کو نہایت مختصر پیرایہ میں بیان کر دیتا ہے، چند آدمی رستم کو پیغام دیتے ہیں کہ:-

فرستادہ ایم از برِ شہریار	کند شاہ ایران ترا خواستار
کنون خیز و پیش شہنشہ خرام	دلیرا یلا پور دستان سام
چنین گفت رستم گوِ نیک بخت	کہ جانم فدائی شہ و تاج و تخت
بگفت این و بر رخش رخشان نشست	برِ خسروِ آمد یلِ چیرہ دست
زمین بوس کرد و ثنا گسترید	بدان سان کہ اورا سزاوار دید

اشعارِ بالا سے جو بیژن نامہ کی پیشرو داستانوں سے نقل کی گئی ہیں واضح ہو گیا ہوگا کہ یہ تکلفات اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو پھیلا کر بیان کرنا جو داستان بیژن کے ضمن میں دیکھا جاتا ہے فردوسی کا مسنمرہ انداز نہیں ہے لیکن یہ داستان چونکہ اس کی کوشش کا پہلا نتیجہ تھی اس لیے جہاں تک ہو سکا شاعر نے اپنے پہلے نمونے کو نہایت رنگینی اور رونق کے ساتھ پیش کیا۔

(۹) سب سے بہتر اور معتبر دلیل داستان بیژن کی اوّلیت کے حق میں شہادت کلام ہو سکتی ہے۔ اس سے ہمارا مقصد ہے کہ اگر یہ داستان حقیقت میں قدیم ہے تو اس کی زبان اور شاہ نامہ کی زبان میں یقینی فرق ہونا چاہیے اور اگر اس فرق کے دریافت کرنے میں ہم کامیاب ہو گئے تو گویا دوسرے الفاظ میں ہم نے اپنے دعوے کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا۔ ایک ہی شخص کے دو مختلف زمانوں کے

کلام سے مادۂ فارق دریافت کرنا اصولاً اگرچہ مستند آزمائش اور صحیح طریقہ ہے لیکن وہ کثیر مطالعہ کا متقاضی ہے۔ بدقسمتی سے ہم اس آخری شرط کی ایفا سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ البتہ سطحی مشاہدہ کے اعتبار پر کہا جا سکتا ہے کہ اس قدر زمانہ گزرنے کے باوجود داستان بیژن میں ایسے آثار موجود ہیں جو فردوسی سے ماسبق اساتذہ دقیقی و رودکی میں پائے جاتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر الف زائدہ کا استعمال ملاحظہ ہو۔ ع

نو بہار آمد و بہ شگفت گل یاسمنا

یاسمنا کے آخر میں الف زائدہ ہے اور تحسین کلام کی خاطر استعمال ہوا ہے وہ اسم اور فعل دونوں کے آخر میں اضافہ کردیا جاتا تھا مثلاً دقیقی کا یہ شعر۔

به پیش اندر آمد به دست اندرا | بزہر آبدادہ یکے خنجرا

یا یہ شعر۔ بدو زرخ درون دیدم اہرمنا | نیازستمش گشت پیرامنا

یا یہ بیت ۔ یکے چارہ باید سگالیدنا | وگرنہ رہِ ترک مالیدنا

داستان بیژن اس الف کی بہت مثالیں ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ مثلاً ایک مقام کے یہ تین مسلسل ابیات ۔

بایوان افراسیاب اندرا | ابا ماہروئے بہ بالین سرا

بہ پیچید بر خویشتن بیژنا | بہ یزدان پناہید زاہرمنا

چنین گفت کای کردگارا مرا | رہائی نخواہد بدن زاایدرا

ایک موقع پر یہ دو بیت آتے ہیں ۔

بہ پرسش کہ چوں آمدی ایدرا | کہ آوردت ایدون بدینجا درا

پریزادهٔ یا سیا وخشیا   کہ دل را بمہرت ہمی بخشیا

یا یہ شعر بہرِ نیکوئی بہرہ ور بودیا   چنان کز دلم زنگ بزدودیا

اس قسم کی اور مثالیں بہم پہنچائی جا سکتی ہیں اور یہ کہنا مبالغے میں داخل نہیں کیا جا سکتا کہ تنہا داستانِ بیژن میں الف تحسین کا استعمال ۲۷ موقعوں پر ہوا ہے جو بجائے خود ایک حیرت میں ڈالنے والا امر ہے شاہنامہ کی ابتدائی داستانوں مثلاً داستان کیومرث وغیرہ میں بعض موقعوں پر ہم پھر الف تحسین سے دوچار ہوتے ہیں لیکن نہ اس کثرت کے ساتھ وہ بھی بعد تلاش دوچار مقام پر ملتا ہے۔ داستان ہائے مابعد میں اس کی حاضری کم سے کمتر ہوتی جاتی ہے حتیٰ کہ اس کی موجودگی غزنوی دور کی داستانوں میں من قبیل شاذ ہے۔

فردوسی کی ابتدائی اور بعد کی داستانوں میں یہ نمایاں تفاوت ناقابلِ تشریح رہتا ہے اس کی معماکشائی اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ زمانہ کے انقلاب کے ساتھ ساتھ فارسی زبان بھی انقلاب کے تھپیڑوں کا تختۂ مشق بن رہی تھی اور زبان میں جدید تغیّرات واقع ہو رہے تھے۔ فردوسی ایک باخبر ماہر ہونے کی حیثیت سے ان تغیّرات سے ہمیشہ بروقت وقوف حاصل کرتا رہا۔ باغ سخن کا یہ سب سے بہتر اور ماہر باغبان اپنی جھولی میں وہی پھول چنتا رہا جو سکۂ رواں کی فہرست میں شامل تھے اور عدالت سخن سے جو لفظ خاطی اور مجرم قرار دیا گیا اس کو زبردست فردوسی بھی اپنی اقلیم میں پناہ نہیں دے سکتا تھا۔ چنانچہ الف تحسین جس کا داستان بیژن میں فردوسی اس قدر شائق معلوم ہوتا ہے آخر کار

اسی فردوسی کا شاہ نامہ اس کا گورستان بنا۔

گزشتہ بیانات اور دلائل سے ہم ناظرین کو اس امر کا یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ داستان بیژن محض تفریحاً فردوسی نے اپنی بیوی کی خاطر سے نظم کردی تھی اور جب اس نظم نے شایع ہوکر قبولیت عام کا خلعت حاصل کر لیا تو دوستوں کی تحسین اور سخن فہموں کے اصرار نے فردوسی کو تمام شاہ نامہ کی نظم پر آمادہ کردیا۔ دقیقی کی یاد ان دنوں میں تازہ تھی اور اس کے اشعار کا بھی چرچا باقی تھا، اس کی وفات کو کل انتیس سال گزرے تھے اور فردوسی جیساکہ ہم کو علم ہے دقیقی کے کلام سے خوب واقف تھا اگرچہ وہ اس کا چنداں قائل نہیں معلوم ہوتا تاہم اس میں شک نہیں کہ شاہ نامہ کے معاملہ میں فردوسی دقیقی کا ممنون ضرور ہے، اس کو اقرار ہے کہ اس معاملہ میں وہ میرا رہبر تھا۔ ع

ہم او بود گوینده را راہبر

وہ دقیقی کی شہرت سے واقف تھا اور اس کے نقشِ قدم پر چل کر وہی ہر دلعزیزی اپنے لیے حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔

شاہ نامہ کی نظم کے خیال سے وہ اپنے وطن سے روانہ ہوکر بخارا پہنچا اس سفر سے اس کا یہی مقصد تھا کہ دفتر پہلوی کا کامل نسخہ پیدا کرے چنانچہ دیباچہ میں کہتا ہے:۔

دلِ روشنِ من چو برگشت ازوے | سوئے تخت شاہجہاں کرد روے
کہ این نامہ را دست پیش آورم | ز دفتر بہ گفتار خویش آورم

اسی غرض سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہرات اور مرو بھی پہنچا۔ ہرات میں پیر خراسان یا ماخ سے کچھ واقعات معلوم کیے۔ مرو میں احمد بن سہل

کے ہاں آزاد سرو رہتا تھا اس سے مل کر داستان شغاد حاصل کی۔ اسی غایت سے اس کا گزر بلخ میں بھی ہؤا ہے اور کسی موبد سے خسرو پرویز کی گرفتاری کے حالات دریافت کیے ؎

چنین یاد دارم ز موبد بہ بلخ　　　بہ خسرو چو شد اینجہان تار و تلخ

یہ شعر میں نے ایک ایسے قلمی شاہ نامہ سے لیا ہے جو ۷۵۲ھ میں لکھا گیا تھا۔ الغرض جہاں گیا اپنی تلاش میں سرگرم رہا اور جس سے ملا کچھ نہ کچھ تحقیق اور تفتیش کرتا رہا وہ کہتا ہے ؎

بپرسیدم از ہر کسے بے شمار　　　بترسیدم از گردش روزگار

اس کے عزم کے خلاف دو زبردست مانع تھے اوّل عمر کی ناپائیداری دوسرے بے دولتی اور ناداری چنانچہ :-

مگر خود درنگم نباشد بسے　　　بباید سپردن بدیگر کسے

دو دیگر کہ گنجم وفادار نیست　　　ہمان رنج را کس خریدار نیست

زمانہ میں کچھ ایسی ناموافق ہوا چل رہی تھی کہ ملک بدامنی اور پریشانی میں مبتلا تھا۔ آل سامان اپنے تخت پر کمزور تھے، ان کے غلام اور ماتحت رؤسا ہر طرف سرکش ہو کر خود مختار حکمران بن بیٹھے تھے، چاروں طرف فساد اور جنگ کی آتش برپا تھی ۳۵۲ھ میں الپتگین خراسان کو خیرباد کہہ کر غزنین آ چکا تھا، سامانی امیر منصور بن عبدالملک نے اس کی ایالت ابوالحسن محمد بن ابراہیم سیمجور کو دے دی تھی اس کے خلف ابوعلی سیمجور نیز فائق نے سامانیوں کے خلاف عرصہ تک علم بغاوت بلند رکھا۔ ان کی سرکوبی کے لیے کئی مرتبہ سامانیوں نے تکلیف کی نیز سبکتگین جانشین بلکاتگین کو بھی اس میں حصہ لینا پڑا۔ یہی محاربات ہوں گے

جن کے متعلق شاعر دیباچہ میں اشارہ کرتا ہے ؎

زمانہ سرائے پر از جنگ بود	بجویندگان بر جہان تنگ بود

انھیں ایام میں اس کا دوست جس کو فردوسی مہربان دوست اور دیباچۂ بایسنغری محمد لشکری لکھتا ہے فردوسی سے ملا اور جب فردوسی کے شغل اور ارادہ کی اس کو اطلاع ہوئی تو اس نے اصرار کے ساتھ اس سے درخواست کی کہ یہ کام تم کرو تمھاری طبیعت رزمیہ اشعار کے لیے رسا واقع ہوئی ہے، تمھاری زبان پاکیزہ ہے اور اپنے اس جوہر سے بادشاہوں کے ہاں اقتدار اور آبرو حاصل کرو۔ پوری کتاب میرے پاس پڑی ہے میں دے دوں گا یہ کہہ کر وہ گیا اور کتاب بھی لے آیا۔ قدردان سرپرست جو فردوسی کا تفقد کرتا بقول دیباچۂ بایسنغری منصور بن محمد کی ذات میں مل گیا اس شریف سردار نے فردوسی کے ذوق کو معلوم کرکے اس کی ہر قسم کی کفالت کی خدمت اپنے ذمے لی۔ یہ فیاض رئیس جس کی نہایت جوشیلے انداز میں فردوسی ثنا خوانی کرتا ہے یکایک موت کا شکار بن گیا۔ موثر الفاظ میں شاعر نے اس کا مرثیہ دیباچہ میں لکھا ہے۔ مرحوم نے نصیحت کی تھی کہ جب یہ کام ختم ہو تو کسی بادشاہ کے پاس لے جانا وہ اس کی قدر کرے گا اور محنت کی داد دے گا۔

الغرض کچھ ایسے اسباب تھے جنھوں نے فردوسی کو تمام شاہ نامہ کی نظم پر آخر کار مستعد کر دیا۔ شاہ نامہ کی ابتدا کس زمانے سے ہوئی؟ اس کے متعلق اگرچہ فردوسی نے کوئی تصریحی اشارہ نہیں کیا۔ تاہم بعض ضمنی امور سے ہم اس زمانے کو متعین کرنے کے قابل ہیں۔

خاتمۂ شاہ نامہ میں وہ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ میں نے کامل پینتیس

سال اس کی تصنیف میں صرف کیے چونکہ سنہ ۴۰۰ھ میں شاہ نامہ ختم ہوا اس لیے ظاہر ہے کہ سنہ ۳۶۵ھ میں شاہ نامہ کی تعمیر کا پہلا سنگِ بنیاد قایم کیا گیا ہوگا۔

اگر اس شعر پر اعتبار کیا جائے۔

بسے رنج بردم درین سال سی — عجم گرم کردم بدین پارسی

تو سنہ ۳۷۰ھ شاہ نامہ کے آغاز کا سال ٹھہرتا ہے۔

سنہ ۳۸۸ھ میں سلطان محمود کی تخت نشینی کے ایام میں جب وہ چھیاسٹھ سال کا ہے کہتا ہے ؎

سخن را نگہ داشتم سال بیست — بداں تا سزاوار ایں گنج کیست

اس حساب سے سنہ ۳۶۸ھ پہلا سال ہے

نوشیرواں کی داستان کی ابتدا میں فردوسی کہتا ہے ؎

چل و ہشت بُد عہدِ نوشیرواں[۱] — تو بر شصت رفتی نمانی جوان

---

[۱] عہد نوشیرواں کے دو معنی لیے جا سکتے ہیں یا ایام سلطنت نوشیرواں عادل جس نے کہا جاتا ہے اڑتالیس سال سلطنت کی یا بروئے کنایہ کوئی زمانۂ امن و آرام ان معنوں میں فردوسی سلطان محمود کی مدح میں لکھتا ہے ع کنوں عہد نوشیرواں تازہ شد۔ میں پہلے معنی سے اعراض کر کے دوسرے معنی کو ترجیح دیتا ہوں میرے رجحان کے مویدیہ قرائن ہیں۔ بیت مذکور میں مصرع آخر صریحاً فردوسی سے تعلق رکھتا ہے جس میں شاعر اپنی عمر کی طرف اشارہ کرتا ہے اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ پہلا مصرع بھی فردوسی سے علاقہ رکھے۔ اور چل و ہشت سے شاعر کی اپنی عمر کے ایک خاص زمانہ کی طرف تلمیح قایم کی جائے + اس بیت کے اشعار ماقبل سلسلہ وار ہیں۔ جن میں شاعر اپنے متعلق ذکر کر رہا ہے۔ ایک تنہا مصرع کو لے کر نوشیرواں کی طرف نسبت دینا مستبعد ضرور معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ ان اشعار کے سلسلے کے انقطاع پر نوشیرواں کے حالات شروع ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی عمر میں جب وہ اڑتالیس سال کا تھا کوئی خوش گوار واقعہ یا انقلاب رونما ہوا ہے۔ یہ واقعہ ظنِ غالب ہے کیونکہ اور کوئی توجیہ (بقیہ نوٹ صفحہ ۲۳ پر)

سنہ ۳۸۸ھ میں وہ چھیاسٹھ سال کا ہے جب اڑتالیس سال کا ہوگا تو سن ہجری سنہ ۳۷۰ھ ہوگا اور یہ سال آغازِ شاہ نامہ ٹھہرتا ہے۔

سنہ ۴۰۰ھ میں وہ اپنی عمر قریب ہشتاد ظاہر کر رہا ہے ؎

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد امیدم بیک بارہ برباد شد

اب اس "نزدیک ہشتاد" سے کون سا سال مانا جائے۔ اُناسی یا اٹھتّر اگرچہ ظاہر ہے وہ اسّی سال کا اس وقت نہیں تھا۔ یہ معلوم ہے کہ سنہ ۳۸۸ھ میں وہ چھیاسٹھویں سال میں تھا تو ظاہر ہے کہ سنہ ۴۰۰ھ میں وہ اپنی عمر کا اٹھتّرواں دور طے کر رہا تھا۔ اس حساب سے بھی شاہ نامہ کی ابتدا کا سال سنہ ۳۷۰ھ نکلتا ہے۔

اس تحقیقات نے ہم کو کئی سال دیے ہیں یعنی سنہ ۳۶۵ھ سنہ ۳۶۸ھ اور سنہ ۳۷۰ھ چونکہ آخر الذکر سال کئی قرینوں سے برآمد ہوتا ہے اس لیے میں اسی کے حق میں فیصلہ دیتا ہوں اور سنہ ۳۷۰ھ کو شاہ نامہ کی باقاعدہ ابتدا کا پہلا سال مانتا ہوں جب کہ فردوسی اپنے "مہربان دوست" اور منصور بن محمد کی تحسین و ترغیب سے متاثر ہو کر انجام کارِ شاہ نامہ کی نظم پر کمر بستہ ہو جاتا ہے۔ داستانِ بیژن ظاہر ہے کہ سنہ ۳۶۵ھ میں اس سن سے پانچ سال پیشتر لکھی جا کر شایع ہو چکی تھی جس کے جامۂ شعر پہنانے کی اصلی محرک فردوسی کی بیوی ہے۔

میری نگاہ میں یہ نامعلوم عورت نہ صرف بیژن نامہ بلکہ تمام شاہ نامہ کی اوّلین محرک ہے۔ شاہ نامہ کی اصلی تحریک دہندہ کا احسان اب تک ہماری ابیات میں ایک نامعلوم کمیت رہی ہے اور اس کا تشکر ایک فراموش شدہ وام کی طرح اب تک ہمارا بار دوش ہے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۲) قایم ہو نہیں سکتی) شاہ نامہ کی نظم کے ابتدا سے تعلق رکھتا ہے۔

ہجوِ سُلطان محمُود غزنوی

اُن واقعات اور اسباب کی تلاش میں جن سے فردوسی سُلطان محمود کی ہجو لکھنے پر مجبور ہوًا ہم اس قدر مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں کہ باوجود کوشش بلیغ ناظرین کو کسی تنقیدی فیصلے کی طرف رہنمائی کرنے سے ہم اپنے آپ کو قاصر پاتے ہیں۔ ان مشکلات کے ذمّے دار وہ متعدد بیانات ہیں جو فردوسی کے سوانح نگار ایک دوسرے کے برخلاف پیش کر رہے ہیں۔ دیباچہ نگار بایسنغر خانی اور اس کے متبعین کا کثیر گروہ کچھ ایسی شہادت پیش کر رہا ہو جس سے سُلطان پر نقضِ عہد کا صریح الزام عاید ہوتا ہو لیکن یہ قصہ اس قدر رنگین اور غیر معمولی معلوم ہوتا ہو کہ عقلِ سلیم اس پر اعتقاد لانے سے انکار کرتی ہو۔ علاوہ ازیں ان کا زمانہ فردوسی کے زمانے سے اس قدر دُور دراز واقع ہوًا ہو کہ قدیم شہادت کی موجودگی میں ان کے بیانات کی کوئی معتدبہ وقعت نہیں رہتی جس

حالت میں کہ مؤخّر الذکر ان کی صاف تردید اور تکذیب کر رہی ہے۔

اِس سے ہماری مراد دیباچۂ قدیم اور نظامی عروضی ہیں۔ فردوسی ادبیات میں ہمارے پاس یہ دو نہایت قدیم اسناد ہیں جو بالترتیب پانچویں اور چھٹی صدی ہجری سے تعلق رکھتی ہیں لیکن بدقسمتی سے یہ قدیم اسناد بھی باہم متناقض ہیں باستثنار چند امور۔

دیباچۂ قدیم کی مختصراً یہ شہادت ہے کہ عنصری کی معرفت فردوسی دربار میں آتا ہے اور شاہ نامہ کی نظم کے لیے مقرر ہوتا ہے، امتحاناً داستان سیاوش سے ایک ہزار بیت نظم کر کے سلطان کی خدمت میں پیش کرتا ہے جو پسند آتے ہیں اور ایک ہزار دینار زرِ رُکنی دیے جانے کا حکم ملتا ہے۔ چھ سال میں فردوسی شاہ نامہ اختتام کو پہنچا دیتا ہے لیکن چونکہ شرطِ ادب نگاہ نہ رکھ کر کتاب میں اپنے مذہب کا ذکر کرتا ہے ؎

گرت زیں بد آید گناہِ من ست　　　چنین ست و ایں رسم و راہِ من ست

سُلطان برہم ہو کر سیاست کا حکم دیتا ہے۔ عنصری اور دیگر شعرائے دربار سفارش کر کے معافی دلواتے ہیں۔ جب انعام کا موقع آتا ہے تو چونکہ شاہ نامہ میں ساٹھ ہزار ابیات تھے، اس لیے حسبِ قرار داد ساٹھ ہزار دینار زرِ رُکنی شاعر کو ملنے چاہیے تھے لیکن منصور روایت کرتا ہے (منصور کسی راوی کا نام ہے) کہ سُلطان کے دبیر ابوسہل ہمدانی کے عرض کرنے پر کہ یہ کثیر رقم ایک شاعر کو مرحمت ہونا کیا ضرور ہے اگر اس کے عوض ساٹھ ہزار درم سیم دیے جائیں تو بھی بہت ہے، سلطان اس تعداد کے درم ہمارے شاعر کے پاس بطور صلہ بھجواتا ہے۔ فردوسی اس وقت حمّام میں تھا، بیس ہزار درم حمّامی بیس ہزار فقاعی اور بیس ہزار انعام لانے والوں کو بخش دیتا ہے اور

حمّام سے نکل کر یہ دو تین بیت بحرِ متقارب میں لکھ کر ایاز کے سپرد کر کے روٗ پوش ہو جاتا ہے۔ چند روز کے بعد ایاز وہ کاغذ حسب ہدایت فردوسی سُلطان کے روٗ بروٗ پیش کرتا ہے۔ سُلطان اس کو گنج نامہ کا کاغذ خیال کر کے نہایت شوق سے کھولتا ہے اور پڑھ کر نہایت متغیر ہوتا ہے۔ فردوسی کی گرفتاری کے لیے پچاس ہزار درم کا اشتہار لگا دیا جاتا ہے لیکن فراری کا کسی طرف پتہ نہیں چلتا۔ سُلطان اُدھر سے مایوس ہو کر اپنا طیش اپنے وزیروں اور دبیروں پر نکالتا ہے۔ ان کو اپنی بدنامی کا بانی کہتا ہے اور سیاستاً ان کو موقوف اور شہر بدر کر دیتا ہے۔

برخلاف اِس کے نظامی عروضی کا بیان ہے کہ شاہ نامہ طوس میں ختم ہو کر خواجۂ بزرگ احمؒد بن حسن میمندی کی وساطت سے دربارِ سُلطانی میں پہنچا۔ لیکن خواجہ کے دشمنوں نے دراندازی کر کے اور فردوسی کو رافضی اور معتزلی ثابت کر کے سُلطان کو صرف پچاس ہزار درم عطیّہ دینے پر راضی کر لیا۔ یہ انعام فردوسی حمامی اور فقاعی میں تقسیم کر کے اور سیاست سُلطانی سے خائف ہو کر راتوں رات غزنین سے فرار ہو گیا۔ طبرستان پہنچ کر سُلطان کی ہجو میں اِس نے ایک سو بیت لکھے اور شہریار والیِ طبرستان سے عرض کی چونکہ یہ کتاب تمھارے اجداد اور اسلاف کے حالات میں ہے اس لیے میں اس کو تمھارے نام سے منسوب کرتا ہوں۔ شہریار نے کہا کہ محمود میرا آقا ہے یہ کتاب تو اسی کے نام پر رہنے دے تیری محنت کا صلہ تجھ کو اپنے وقت پر مل جائے گا البتہ سُلطان کی ہجو میں خریدنا چاہتا ہوں یہ تو مجھے دے دے۔ دوسرے روز ایک لاکھ درہم شہریار نے فردوسی کے پاس بھجوا دیے۔ جس نے صفحۂ کاغذ سے

اس کو دھو ڈالا سُلطانی ہجو اس طرح ضائع ہوگئی اور یہ چھ بیت من جملہ اس کے باقی رہ گئے۔

مرا غمز کردند کاں پُر سخن | بمہرِ نبی و علی شد کُہن
اگر مہرِ شاں من حکایت کنم | چو محمود را صد حمایت کنم
پرستار زادہ نیاید بکار | وگر چند دارد پدر شہریار
ازیں در سخن چند رانم ہمی | چو دریا کرانہ ندانم ہمی
بہ نیکی نہ بد شاہ را دستگاہ | دگرنہ مرا برنشاندے بگاہ
جو اندر تبارش بزرگی نبود | نیارست نامِ بزرگاں شنود

ان بیانات میں ہم دیکھتے ہیں کہ دیباچۂ قدیم و نظامی سوائے دو باتوں کے اور تمام امور میں ایک دوسرے کے برخلاف ہیں دونوں کو صرف اس بات پر اتفاق ہے کہ سُلطان بوجہ اختلاف مذہبی فردوسی سے ناراض ہوا اور یہ کہ فردوسی نے سلطان کی ہجو ضرور لکھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا بوجہ تخالف مذہبی سُلطان محمود فردوسی سے ناراض ہوا اور کیا فردوسی نے انعام نہ ملنے پر سُلطان کی ہجو لکھی؟ یہ سوالات ہیں جن پر ہم ذیل میں بحث کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے پیشتر ہم مخالفت مذہب کے مسئلے کو لیتے ہیں۔

شاہ نامہ میں ایک مقام ایسا آگیا ہے جہاں بعض اشعار ہماری تلاش کے مقصد پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں داستان شیرین و خسرو کی ابتدا میں فردوسی تذکرۃً کہتا ہے ؎

کنوں داستانِ کُہن نو کنم | سخن ہائے شیرین و خسرو کنم
کُہن گشتہ ایں نامۂ باستاں | زگفتار و کردار آں راستاں

ہمی نو کنم مرورا زیں نشان	کہ تا یاد دارند از سرکشاں
بود بیت شش بار بیور ہزار	سخن ہائے شایستۂ غم گسار
نہ بیند کسے نامۂ پارسی	نبشتہ با بیات صد بار سی
وگر باز جویند از و بیت بد	ہمانا کہ باشد کم از پنج صد
چنیں شہریارے و بخشندۂ	بگیتی زشاہاں درخشندۂ
نکرداند ریں داستاں ہا نگاہ	ز بدگوئے و بختِ بد آمد گناہ
در اُفتاد بدگوئے در کارِ من	تبہ شد برِ شاہ بازارِ من

یہ اشعار ظاہر ہے کہ ایسے وقت لکھے گئے ہیں جب شاہ نامہ اختتام کو پہنچ گیا ہے اور فردوسی کو اپنی تالیف کے اشعار کی تعداد معلوم ہو چکی ہے وہ اُن کی تعداد "شش بار بیور" بتاتا ہے یعنی ساٹھ ہزار اور کہتا ہے کہ فارسی زبان میں ابھی تک تین ہزار شعروں کی کتاب بھی دستیاب نہیں ہوئی۔ چہ جائے کہ میری کتاب کے ہم پلہ ہو۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی کہہ رہا ہے کہ اس میں کمزور اور خراب اشعار کی تعداد کم سے کم پانسو ہو گی۔ سلطان کی نسبت گویا ہے کہ ایسا پادشاہ جو دنیا کے بادشاہوں میں ممتاز ہے تعجب ہے کہ اُس نے میری کتاب کی طرف کچھ توجہ نہیں کی۔ جس کی دو وجہ وہ قایم کرتا ہے۔ پہلی دشمن کی سعایت دوسری اپنی بد نصیبی۔ دشمن کی بدگوئی کے ذکر میں وہ کہتا ہے کہ اس نے میرے معاملات میں ایسی کارروائی کی جس سے بادشاہ کی نگاہ میں میرا بازار بالکل تباہ ہو گیا۔

فردوسی ہم سے یہ نہیں کہتا کہ وہ بدگو کون تھا اور اُس کی بدگوئی کی کیا نوعیت تھی۔ اب ظاہر ہے کہ فردوسی کے تذکرہ نگاروں کے دو فریق (جن میں ایک فرقہ غالباً سُنّی ہے اور دوسرا شیعی) اور ان کے اپنے اپنے

زاویۂ نگاہ سے مختلف اقوال، ایک کا خواجہ احمدؒ بن حسن میمندی کو فردوسی کا دوست اور سرپرست بیان کرنا، دوسرے فرقے کا خواجہ کو خارجی اور فردوسی کا دشمن کہنا بر خلاف اس کے ایاز کو فردوسی کا دوست ظاہر کرنا دوسرے فرقے کا اس کی تردید میں ایاز کو فردوسی کا دشمن بیان کرنا اور اُس کو نقصان پہنچانا وغیرہ وغیرہ ہماری رائے میں محض فرضی اور مصنوعی قصّے ہیں جو دونوں فرقوں نے ان اشعار کی تشریح کے مقصد سے ایجاد کیے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ جب خود فردوسی اپنے دشمن کا نام نہیں جانتا اور اگر حقیقت میں جانتا ہے تو بیان کرنا نہیں چاہتا تو اس کے معاصرین کو بھی صحیح واقعات کی اطلاع نہیں ہوسکتی چہ جائے کہ ایسے لوگوں کو جو فردوسی کے زمانے اور اُس کے واقعات کے بہت عرصہ بعد پیدا ہوئے۔ بدگوئی کی تاویل میں کہا جاتا ہے کہ فردوسی شیعہ یا رافضی تھا میرے خیال میں یہ تاویل بیکار معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ فریقین تنافر کا یہ قعرِ عمیق جو سُنّی اور شیعہ کو فی زمانہ جدا کر رہا ہے اُس وقت حائل نہیں تھا۔ دونوں فرقوں میں تعلّقات خوش گوار تھے اور خود سلطان محمود کی دختر امیر منوچہر والی طبرستان کو بیاہی گئی تھی جو شیعہ خاندان سے علاقہ رکھتا تھا۔ اس قدر ضرور مفہوم ہوتا ہے کہ وہ بدگوئی خواہ کسی نوعیت سے کیوں نہ ہو اُس کے تشیع پر دال نہیں ہوسکتی۔ کسی سُنّی کے لیے یہ کہنا کہ وہ سُنّی ہے بدگوئی کی تعریف میں داخل نہیں۔ علیٰ ہذا کسی شیعہ کو یہ کہنا کہ وہ شیعہ ہے بدگوئی نہیں ہوسکتی البتہ ایک سُنّی یا شیعہ کو ان زمانوں میں ملحد یا قرمطی کہنا بدگوئی مانا جاسکتا ہے لیکن واقعہ اگر ایسا ہوتا تو ضرور ہے کہ فردوسی بطور احتجاج اس کی تکذیب یا تردید کرتا۔ بالخصوص جب ہم ناظرین کو یہ اطلاع

دیں گے کہ مذکورۂ بالا ابیات امیر نصر بن ناصر الدین سلطان محمود غزنوی کے سگے اور پیارے بھائی کو خطاب کر کے شاعر نے لکھے ہیں۔ اس استدلال سے یہی ایک نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ فردوسی خود اپنے دشمن اور اُس کی دشمنی سے ناواقف محض تھا ورنہ ضرور امیر نصر کو اس کی حقیقی کیفیت سے اطلاع دیتا اور یہ کہ فردوسی کے مذہب سے اِس معاملہ کو کوئی تعلق نہیں تھا۔

یہ امر فردوسی کی طبیعت میں داخل ہے کہ خارجی واقعات سے خواہ خفیف ہوں یا اہم نہایت متاثر ہوتا ہے اور اُن کا ذکر بھی بطور جملہ معترضہ شاہ نامہ میں ضرور کر دیتا ہے۔ تعجب ہے کہ فردوسی اپنی عمر بھر کی امیدوں کے خون ہونے کے واقعے کو صرف دو شعروں میں بیان کر دیتا ہے اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی ناکامی کے اسباب اور اُن کے بانیوں سے قطعاً تاریکی میں تھا۔ البتہ اس قدر اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ سُلطان کی سرد مہری اور بے توجہی اِس ناکامی میں ایک نمایاں عنصر تھی۔

فردوسی کی ناکامی پر رائے زنی کرتے وقت ہمیں یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ مذہبی حلقوں میں فردوسی اپنی تصنیف میں عربوں کے ساتھ منصفانہ اور غیر جانب دارانہ سلوک مرعی نہ رکھنے کا ملزم بنایا گیا ہے الزام اِس میں شک نہیں ایک حد تک درست ہے اِس بنا پر ملک میں جذبات اس کے خلاف برافروختہ ہو گئے تھے اِس کی تصدیق کتاب عمر نامہ سے ہوتی ہے جو شاہ نامہ کے رد میں بقول مولٰنا شبلی ان ہی ایام میں تالیف ہوئی تھی۔ اس جوشِ مخالفت کا اثر فردوسی کے خلاف کہاں تک ہوا اور سلطان کے ہاں اُس کی ناکامی

میں اُس نے کوئی نیا سبب اضافہ کیا ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن یہ بدیہی ہے کہ فردوسی اپنی زندگی کے ایّام میں غیر مقبول ضرور رہا۔ اس کی حمایت میں ردِعمل فردوسی کے زمانے کے بعد کی تحریک ہے جب کہ آنے والی نسلوں کو شاہ نامہ کی سحر بیانی تسخیر کر چکی ہے اسی طرح مثنوی یوسف زلیخائے فردوسی اس کے نام پر منڈھ دی گئی جس میں ایران پرست اور فلسفی طبع فردوسی ایک تائب اور دین دار و متقی مُسلمان کی حیثیت سے دکھایا گیا ہے۔

فردوسی کی ناکامی کا اصلی سبب میرے خیال میں غریب فضل بن احمدؒ کی تباہی، قید اور ہلاکت سے تعلق رکھتا ہے جو واقعہ شاہ نامہ کے اختتام کے قریب زمانے میں رونما ہوتا ہے۔ ایشیائی درباروں میں کسی شخص کی رسائی اور کامیابی ہم یقینی طور پر جانتے ہیں بغیر طاقتور تائید یا سفارش کے ناممکن ہے۔ محمود کا دربار کسی وقت بھی فریقی منافشات اور حریفی جدال سے خالی نہیں رہا۔ طاقتور امرا دربار میں ہر وقت ایک دوسرے کی قوت کے استیصال میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ فضل بن احمدؒ دس سال مستقل وزیر رہنے کے بعد اِسی قسم کی سازش اور ریشہ دوانی کا شکار ہوا۔ اس وزیر سے فردوسی کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ فضل عربی زبان اور عربی علوم سے اُمّی محض تھا۔ اسی لیے دفتر کی زبان اُس نے فارسی کردی تھی۔ ادھر فردوسی ایران کی قدیم عظمت و جلال کے افسانے اپنی سادہ مگر برجستہ زبان میں زندہ کر رہا تھا پھر کیا وجہ تھی کہ ان دو زبردست ہستیوں کے قلوب میں ایک دوسرے کا پاس اور احترام نہ ہو۔ فردوسی جو بالطبع مدح خوانی اور قصیدہ سرائی سے نفرت رکھتا تھا شاہ نامہ میں

کئی مقام پر فضل بن احمدؔ کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ دیباچہ میں بھی ایک تلمیح اسی وزیر کی طرف ہے ایک اور مقام پر کہتا ہے ؎

کجا فرش را مسند و مرقد ست | نشستن گہِ فضل بن احمدؔ ست

اسی وزیر کا شکریہ کرتے ہوئے فردوسی کہتا ہے ؎

ز دستور فرزانۂ داد گر | پراگندہ رنجِ من آمد بسر

جس حالت میں کہ فردوسی فضل بن احمد کا آوردہ یا دوست مان لیا گیا تھا تو ظاہر ہے کہ وزیر کے دشمن ہمارے شاعر کو کسی حالت میں کامیاب ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔

آیندہ فردوسی کا کیا طرزِ عمل رہا۔ آیا ہجو لکھ کر اُس نے اپنے دل کا بخار نکالا یا کوئی اور طریقہ جو اُس سے زیادہ مفید ہو سکتا ہے اختیار کیا۔ غزنین کے قیام کے دوران میں فضل بن احمدؔ کے علاوہ ایک اور زبردست شخص نے فردوسی کے معاملات میں دلچسپی لی ہے وہ امیر نصر بن ناصر الدین سبکتگین ہے۔ فردوسی کئی موقعوں پر اس کی مدح میں رطب اللسان ہے۔ دیباچہ میں کہتا ہے ؎

زگیتی پرستندۂ فرّ نصر | زید شاد در سایۂ شاہِ عصر
کسے کش پدر ناصر الدین بود | ہیئ تخت او تاج پروین بود
خداوند مردی و رای و ہنر | بدو شادماں مہتراں سر بسر
بو بیژہ دلاور سپہ دارِ طوس | کہ در جنگ بر شیر دارد فسوس

سکندر کی وفات کے موقع پر سلطانی مدح کے ضمن میں فردوسی امیر نصر کے متعلق پھر گویا ہے ؎

سپہ دار و سالارِ او میر نصر | کزو شادمان ست گردندہ عصر
سپہ دار چوں بوالمظفّر بود | سرِ لشکر از ماہ کمتر بود

که پیروز نام ست و پیروز بخت | همی بگذرد کلک او از درخت
همیدون سپه دار او شاد باد | دلش روشن و گنجش آباد باد

امیر نصر کے جو مختصر حالات تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں اُن سے دریافت ہوتا ہی کہ وہ نہایت قدر دانِ علم و فن تھے۔ فرشتہ مزاج ایسے کہ مدّت العمر کبھی منہ سے کسی کو گالی نہیں دی۔ حنفی علما کا ایک مدرسہ غزنین میں اپنی یادگار چھوڑا۔ شعرا کے بڑے قدر دان تھے۔ عنصری جو محمودی دور کا آفتاب مانا جاتا ہی پہلے پہل انھیں کے مہدِ شفقت میں پلا اور خود عنصری کو اقرار ہی۔

زرسم تو آموختم شاعری | بمدحِ تو شد نامِ من مشتہر
که بودم من اندر جہاں پیش ازیں | کرا بود در گیتی از من خبر
زجاہِ تو معروف گشتم چنیں | من اندر حضر نامِ من در سفر
زمال و زنامِ تو دارم همی | هم اندر سفر زاد و هم در حضر

القصہ فردوسی نے ان کی طرف رجوع کی اور وہ اشعار پڑھ کر جو دشمن کے حسد اور سلطان کی ناقدر دانی سے تعلق رکھتے ہیں یوں عرض کرتا ہی۔

چو سالارِ شہ آں سخن ہائے نغز | بخواند بہ بیند بپاکیزہ مغز
ز گنجش من ایدر شوم شادماں | کزو دور بادا بدِ بدگماں
وزاں پس کند یاد بر شہریار | مگر تخم رنجِ من آید ببار
که جاوید باد افسر و تخت اوے | ز خورشید تابندہ تر بخت اوے

ان اشعار میں فردوسی امیر موصوف سے یہی درخواست کر رہا ہی کہ آپ جب اس کتاب "سخن ہائے نغز" کو پڑھیں تو اُمید کرتا ہوں کہ قدر دانی کی نگاہ سے

دیکھیں گے اور میں آپ کی فیاضی سے بے نیل مرام نہ جاؤں گا۔ نیز میری یہ درخواست ہے کہ آپ دربار میں بھی سلطان سے میری سفارش کریں شاید اس طرح سے میرا درختِ امید بار آور ہو اور میں کامیاب ہو جاؤں۔

فردوسی کے مساعی کا امیر نصر کے ہاں کیا نتیجہ برآمد ہوا۔ ہم بالکل ناواقف ہیں۔ شاہ نامہ میں اس کے متعلق کوئی ذکر نہیں۔ یہ کتاب اس وقت تک تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ بعد کے واقعات فردوسی اس میں شامل نہیں کر سکتا تھا۔ اگرچہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ امیر نصر کے ہاں وہ کامیاب ہوا یا محروم رہا لیکن قرائن سے پایا جاتا ہے کہ سلطان محمود کی طرف سے مایوس ہی رہا۔ اسی مایوسی کے اثر میں شاعر نے یہ اشعار لکھے ہیں۔ ؎

خنک مرد درویش بادین و ہوش	فراواں جہانش بمالید گوش
کہ چوں بگذرد زین جہان نام نیک	بماند از وہم سر انجام نیک
بدان گیتی اورا بود بہرۂ	بنزدیک یزداں بود شہرۂ
نہ چوں من شدہ خوار و برگشتہ بخت	بدوزخ فرستادہ ناکام رخت
نہ امید عقبیٰ نہ دنیا بدست	ز ہر دو رسیدہ بجانم شکست

(سپری شدن روزگار بہرام، ص۸۳۶، جلد سوم، بمبئی ۱۲۶۸ھ)

آخری دو شعروں سے اس کی انتہائی یاس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

انہی ایام میں فردوسی کے مایوسانہ خیالات و جذبات کا یہ قطعہ شاہد ہے۔ ؎

حکیم گفت کسے را کہ بخت والا نیست	بہیچ وجہ مرادورا زمانہ جویا نیست
برو مجاورِ دریا نشیں مگر روزے	بدستت افتد دُرّے کہ جاش ہمتا نیست
خجستہ درگہ محمودِ زابلے دریاست	کدام دریا کاں را کنارہ پیدا نیست

شدم بہ دریا غوطہ زدم ندیدم دُر　　　گناہ بختِ من ست ایں گناہِ دریا نیست

یہ اشعار اگرچہ مایوسانہ اور جگر خراش ہیں لیکن ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کا قائل کوئی انتقام تجویز کر رہا ہے۔

فردوسی جیسا کہ ہم شاہ نامہ کے مطالعہ سے سیکھتے ہیں ایک بلند حوصلہ اور عالی ظرف انسان تھا بلند ہمت اتنا کہ تکلیف اور ظلم یا اور کسی قسم کی بدنصیبی کو صبر اور تحمّل کے ساتھ برداشت کر لیتا۔ اگرچہ سلطان کی ناقدردانی نے اس کا دل پاش پاش کر دیا تاہم کہا جا سکتا ہے کہ وہ رکیک ہجو لکھ کر انتقام لینے کے ناقابل تھا۔ اس کی شریف طبیعت کے منافی تھا کہ وہی محمود جس کی اُس نے اپنی ضخیم کتاب میں بے شمار موقعوں پر مدح خوانی کی ہے جس کا تن بقول فردوسی "ژندہ پیل اور رُوح جبرئیل ہے۔ اس کا کف ابر بہمن ہے۔ دل دریائے نیل ہے۔ جو بزم میں آسمان وفا ہے اور رزم میں تیز دم اژدہے کی مثال ہے۔ جو بھیڑ اور بھیڑیے کو ایک گھاٹ پانی پلاتا ہے۔ زمانہ جس کے طفیل باغ سدا بہار بن گیا ہے اور جس کی برکت سے بارش وقت پر آتی ہے، گہواروں میں شیر خوار اُس کا نام لیتے ہیں اور ماہ و کیوان اس کو سجدہ کرتے ہیں۔" صرف صلہ سے محرومی کی حالت میں جس کے لیے محمود نے کسی قسم کی ذمّے داری نہیں لی تھی اس لیے کہ شاہ نامہ فردوسی نے محض اپنے شوق سے شروع کیا تھا ؎

من ایں نامہ فرخ گرفتم بفال　　　ہمی رنج بردم بہ بسیار سال

اور محمود کی تخت نشینی سے بیس سال پہلے سے اس پر مصروف تھا ؎

سخن راہ نگہ داشتم سال بیست　　　بداں تا سزاوار ایں گنج کیست

محمود کی اس طرح سے مذمّت کرتا جو پاجیوں اور بازاریوں کا طریقہ ہے۔

فردوسی مال و دولت کا بھی زیادہ فریفتہ نہیں نظر آتا۔ حرص و طمع کا سب سے زبردست دشمن ہم فردوسی میں دیکھتے ہیں۔ اس کے فلسفے میں صرف تین اشیا ضروریات زندگی میں تسلیم کی گئی ہیں۔ غذا، لباس، اور بستر۔ باقی خواہشات اِس کے نزدیک آز کی فہرست میں داخل ہیں اور ممنوعات میں شمار کی گئی ہیں۔ مال کے لیے اس کا قول ہے ؎

زبہرِ درم تُند و بدخو مباش　　تو باید کہ باشی درم گو مباش
کسے کو بگنج و درم ننگرد　　ہمہ روز او برخوشی بگزرد

کیا ایسے اصول کا پابند اور ان مواعظ کا تلقین کنندہ ہم خیال کر سکتے ہیں انعام کے لالچ میں سلطان سے بگاڑتا اور اس کی مذمت کرتا۔

شاہ نامہ ایک عظیم کتاب ہے اس میں فردوسی نے دوست اور دشمن دونوں کا ذکر کیا ہے۔ مگر کوئی موقع ایسا نظر سے نہیں گزرا جہاں فردوسی یاس و قنوط رنج و غصہ اور طیش میں آکر اپنی متانت اور تہذیب کو ہاتھ سے کھو کر عامیانہ زبان استعمال کرے چہ جائے کہ وہ زبان جو کہا گیا ہے فردوسی نے ہجو میں سلطان کے حق میں استعمال کی ہے۔

یہاں ہمیں اس سوال پر بھی غور کر لینا چاہیے کہ آیا فردوسی کو ہجو لکھنے کا حق بھی پہنچتا ہے یا نہیں۔ اس بارے میں عرض ہے:۔

قدیم سے یہ خیال ہمارے ذہنوں پر قبضہ جمائے ہوئے ہے کہ سلطان محمود نے فردوسی سے شاہ نامہ لکھنے کی فرمایش کی۔ فی بیت ایک دینار (سونے کا سکہ) دینے کا وعدہ کر کے آخر میں اپنے قول سے پھر گیا اور دیناروں کے بدلے ساٹھ ہزار درہم (چاندی کا سکّہ) بھجوا دیے۔ اس وعدہ شکنی اور بد معاملگی کی بنا پر شاعر نے سلطان کی ہجو لکھی۔ یہ بد سلوکی فردوسی کے

لیے ہجو لکھنے کی محرک بن سکتی ہے۔ لیکن اصل واقعہ جیساکہ فردوسی کے اپنے بیان سے معلوم ہوتا ہے یوں ہے کہ شاعر اپنی شہرت اور مالی منفعت کی امید میں شاہ نامہ کی نظم پر مستعد ہوا اور سلطان محمود کی تخت نشینی سے پہلے بیس سال تک اس پر کام کرتا رہا۔ اس کی تاجپوشی کے وقت غزنین آیا جہاں چھ سال رہ کر اس نے شاہ نامہ کو تقریباً ختم کر دیا۔ ابتدا میں حالات سازگار تھے۔ آخر میں دشمنوں کی بدگوئی کی وجہ سے سلطان کے دربار سے قطعاً محروم گیا۔ محمود کو شاہ نامہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی نہ اس نے اس کی نظم کا حکم دیا۔ اس صورت میں کیا فردوسی سلطان کی ہجو لکھنے میں حق بجانب مانا جا سکتا ہے۔ وہ قدر دانی کی امید میں آیا تھا اس امید میں اس کو ناکامی ہوئی۔ اس کی تیس پینتیس سال کی محنت کا اکارت جانا شاعر کی زندگی کا تلخ ترین واقعہ ہے مگر سلطان کو اس کا ذمّے دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا خود فردوسی اس نامرادی کو اپنی بدنصیبی پر محمول کرتا ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ جامی کے ہم زبان ہو کر سلطان کے حق میں کہہ سکتے ہیں۔ ؎

گزشت شوکت محمود در زمانہ نماند   جز ایں فسانہ کہ نشناخت قدر فردوسی

مگر یہ ناقدردانی ہجو کے واسطے وجہ جواز نہیں بنائی جا سکتی۔

ہمارے تذکرہ نگاروں کی عقل پر پردے پڑ گئے ہیں جنھوں نے فردوسی کو ہر ذلیل اور مذموم فعل کا مرتکب بنا دیا ہے اس کے دامن پر نہ صرف ہجو کا داغ ہے جو بھک منگے اور ٹکڑ گدے شاعروں کا آلہ ہے بلکہ اس کے علاوہ کئی اور دروازوں پر جس میں والیانِ ماژندران قہستان طبرستان اور بغداد شامل ہیں سر پر شاہنامہ کی عظیم مجلدات کا پشتارہ اور ہاتھ میں کاسۂ گدائی لیے بھجوایا ہے۔ یہاں وہ قصیدہ لکھتا ہے وہاں وہ یوسف زلیخا تصنیف

کرتا ہی۔ قصّہ مختصر انھوں نے ہر ناممکن شئ کو ممکن کر دکھایا ہی۔ یہ یاد رہے کہ اسّی برس کا پیرِ فرتوت بڑھاپے نے جس کی کمر دوہری کر دی ہی آنکھوں سے جس کو بہت کم سوجھائی دیتا ہی کانوں سے تریسٹھویں برس میں بہرا ہو گیا تھا، جس کے اعضا میں لرزہ اور رعشہ غلبہ پا چکا تھا اور جو عصا کی مساعدت کے بغیر ایک قدم بھی حرکت نہیں کر سکتا تھا ان دراز سفروں میں کیونکر اپنا جسم سنبھالنے اور سفر کرنے کے قابل ہو سکا اور پھر سلطانی تعاقب سے بچ کر کئی سال آوارۂ وطن رہ کر اپنی تصنیفات لیے لیے اجنبی رؤسا کے درباروں میں پہنچ کر رسائی بھی پیدا کر لیتا ہی۔ ایسے خلافِ معمول واقعات الف لیلہ کی کہانیوں میں البتہ ملتے ہیں نہ تاریخی اوراق میں۔ فردوسی کا یہ سفر سندباد بحری کے سفر سے کیا کم کہا جا سکتا ہی۔

ہجو کے باب میں خاتمۂ شاہ نامہ بھی کسی قدر روشنی ڈالتا ہی شاعر کی عمر کے اکہترویں سال یا ۳۹۳ھ میں شاہ نامہ ختم ہو جاتا ہی چنانچہ یہ شعر ؎

چو سال اندر آمد بہفتاد و یک　　　　ہمی زیرِ شعر اندر آمد فلک

۴۰۰ھ میں آخری مرتبہ اس نے شاہ نامہ کو ہمیشہ کے لیے بند کرنے کی غرض سے خاتمہ میں قلم اٹھایا ہی ان دو تاریخوں کے درمیان سات سال کا پردہ حائل ہی۔ اچھا فردوسی اس عرصے میں کیا کرتا رہا اور کس شغل میں رہا۔ غالباً وہ شاہ نامہ کی درستی تصحیح اور ترتیب میں مشغول رہا یا جیسا کہ اس کے تمام تذکرہ نویس مدعی ہیں سفر اور مختلف شہروں میں بسر کرتا رہا۔ اگر واقعی فردوسی نے ہجو لکھی ہی تو بہر حال ان سات سالوں کے اندر اندر لکھی جا چکی ہو گی اور قیاسِ سلیم بھی اِسی نظریہ کا مقتضی ہی لیکن ہم یہاں پھر دیکھتے ہیں کہ فردوسی ان آخری ابیات میں بھی سلطان کے ذکر میں

مشغول ہی اگرچہ یہاں وہ مدح گستری نہیں کرتا تاہم ایسے الفاظ میں سلطان کا ذکر کر رہا ہی جن سے ظاہر ہی کہ اس کے جذبات سلطان کی طرف سے تلخ نہیں ہیں۔ وہ کہتا ہی ؎

سی و پنج سال از سرائے سپنج بسے رنج بُردم باُمید گنج
جو برباد دادند رنج مرا نبد حاصلے سی و پنجِ مرا
کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد اُمیدم بیکبارہ برباد شد

اِن ابیات میں اس کے دلی جذبات بھرے ہیں اگرچہ وہ مایوس اور محروم نظر آتا ہی اگرچہ اُس کی تمام آرزوں کا خون ہو چکا ہی تاہم وہ غضب ناک نہیں ہی نہ اس نے اب تک ہجو لکھی ہی نہ اس کے لکھنے پر مائل ہی۔ یہ شکستہ دل بوڑھا شاعر جس کو اُناسی اسّی سردیوں نے بالکل ضعیف فرسودہ اور افسردہ کر دیا ہی اپنے بادشاہ کے حق میں ہاتھ اٹھا کر یہی دُعا دیتا ہوا خاموش ہو جاتا ہی ؎

تنِ شاہ محمود آباد باد ہمیشہ بکامِ دلش شاد باد
چنانش ستودم کہ اندر جہاں سخن ماند ازو آشکار و نہاں
ہمش[۱] رائے و ہم دانش و ہم نسب چراغِ عجم آفتابِ عرب

فردوسی کی محرومی کے متعلق نظامی گنجوی بھی تلمیح کرتے ہوئے نصرۃ الدین سے کہتے ہیں ؎

بیادِ نظامی بکے طاس مہ خوری ہم بہ آئین کاؤس کہ
ثنائی بہ این طاسِ طوسی نواز حقِ شاہ نامہ ز محمود باز

---

[۱] یہ شعر کلکتہ کے شاہ نامہ و دیگر قلمی و مطبوعہ نسخوں میں نہیں ملتا۔ ایک قلمی نسخہ نوشتہ ۷۵۲ھ سے جو باعتبار عمر قدیم ترین نسخہ ہی جو میری نظر سے گزرا ہی نقل ہوا ہی۔

دو وارث شمار از دو کانِ کہن ۔ ترا در سخا و مرا در سخن
بوامی کہ نا دادہ باشد نخست ۔ حقِ وارث از وارث آید درست

اور بہرام نامہ کی تمہید میں فرماتے ہیں :۔

در سخا و سخن چو می پیچم ۔ کار بر طالع است من ہیچم
نسبت عقربی است یا قوسی ۔ بخل محمود و بذل فردوسی
اسدی را کہ جود او بنواخت ۔ طالع و طالعی بہم در ساخت

لیکن شیخ عطار پیلبار انعام دیے جانے کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ شاعر نے اپنی عالی حوصلگی کی بنا پر سلطان کے صلہ کو قبول نہیں کیا ؎

اگر محمود انبارِ عجم را ۔ بداد آن پیل و لشکر واں درم را
اگر تو شعر آری فیل وارے ۔ نیابی یک درم در روزگارے
چہ آں گر فیل وارش کم نہ ارزید ۔ بر شاعر فقاعی ہم نہ ارزید
زہی ہمت کہ شاعر داشت آنگاہ ۔ کنوں بنگر کہ چوں برگشت از راہ

(الٰہی نامہ ۔ کلیات عطار صـ۹۳۴ ، نول کشور)

شہر یار نامۂ مختاری[۱] میں بھی ہجو کی نسبت اشارہ پایا جاتا ہے ۔ میں اس شاعر کا زمانہ تعین کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہوں ۔ ہجو کا ذکر ان اشعار میں ہے ؎

چو مختاری آں بارور داستاں ۔ بنامِ تو گفت ای شہ راستاں

---

[۱] انگریزی ماہرین مختاری کو سلطان محمود غزنوی کے جانشین سلطان مسعود شہید کا معاصر مانتے ہیں اور مختاری کا یہ شعر ان کے خیال کا موئید ہے ؎ گل باغ سلطان محمود شاہ جہاں جوے بخشندہ مسعود شاہ میرے خیال میں یہ مختاری عثمان مختاری غزنوی ہے ۔ شہر یار نامہ کی زبان کی روانی اور صفائی دیکھتے ہوئے ہم کو اس کا زمانہ علاء الدین مسعود بن ابراہیم کے عہد میں ماننا پڑے گا اور کوئی تعجب نہیں اگر بہمن نامہ اور شہریار نامہ ایک ہی دور کے یادگار ہوں ۔

گرم ہدیہ بخشی دریں بارگاہ | بہ پیشِ بزرگانِ با عزّو جاہ
شوم شاد، افزوں شود جاہ تو | ہماں مدح گویم بدر گاہِ تو
وگر ہدیہ نہ دہی ایا شہریار | نرنجم کہ ہستی خداوندگار
زبانِ من از ہجو کوتاہ باد | ہمیشہ ثنا گوئے ایں شاہ باد

ہجو کے بارے میں عالمگیر اعتقاد کے باوجود میری سوءِ ظنی تعجب کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی بالخصوص جب کہ میں اس عقیدے میں بالکل تنہا ہوں اس لیے کہ ہجو سے آج تک کسی نے انکار نہیں کیا ہے اور نہ کسی قسم کا اشتباہ اِس پر کیا گیا ہے لیکن جیسا کہ اوپر دکھایا جا چکا ہے میں محض شاہنامہ کی سند پر اس کے وجود سے منکر ہوں، اس مسئلے کا بہترین فیصلہ تنقید کے ہاتھ میں ہے جو ذیل میں آتی ہے۔

ہجو کی ابتدا اور تعمیر

پیشتر اس کے کہ تنقید کے میدان میں خامہ فرسائی کی جائے چند کلمات ہجو کی اصلیت اور ساخت کے متعلق کہنا بادی النظر میں غیر ضروری معلوم نہیں ہوتا ۔ بقول دیباچۂ قدیم ہجو کل دو تین ابیات پر محدود تھی لیکن ہم ان اشعار سے واقف نہیں ہو سکے۔ بقول نظامی عروضی وہ کُلّہم چھ شعر ہیں ان سے ہم واقف ہیں لیکن نظامی کے بیان کو ہمیں نہایت احتیاط کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان چھ میں بھی دو شعر شاہ نامہ سے سرقہ کیے گئے ہیں۔ پہلا- پرستار زادہ نیاید بکار- الخ- دوسرا- ازیں در سخن چند رانم ہمی | چو دریا کرانہ ندانم ہمی :: یہ وجہ ہے کہ اس بارے میں نظامی کے قول کو ہم بد اعتقادی کی نگاہوں سے

دیکھتے ہیں اور اس عقیدے پر قایم ہو جاتے ہیں کہ ابتدا میں ہجو کی کوئی اصلیت نہیں تھی اور یہ کہ اس کا آغاز فردوسی کے زمانہ کے بعد ہوا ہے۔
ہجو کی ولادت کا قصہ ہمیشہ کے لیے ایک سربستہ راز رہے گا جس طرح کہ فردوسی کے متعلق اور واقعات۔ شاہ نامہ کی عالم گیر شہرت اور سلطان کے ہاں سے فردوسی کی ناکامی کے قصے غالباً اس کی تولید کے ذمے دار ہیں۔ ہر شخص آشوب ماژندرانی کے مانند تنگ چشم اور متعصب نہیں تھا۔ فردوسی کی حمایت میں ردعمل غالباً پانچویں صدی ہجری میں شروع ہو چکا تھا جس کے ابتدائی جراثیم ہم دیباچۂ قدیم میں دیکھتے ہیں اور ہجو کی داغ بیل اسی زمانے میں پڑ چکی تھی لیکن اس کی بالیدگی کی رفتار نہایت تدریجی تھی حتے کہ وسط قرن ششم میں اس کا وجود کُل چھ ابیات پر منحصر تھا۔
فردوسی پرست جماعت اب مُلک میں ہر طرف نظر آتی تھی شاہ نامہ کے اشعار عوام کی زبان پر تھے بادشاہوں کے محل اُن سے گونجتے تھے خطیبوں کے منبر سے وہ سنائی دیتے تھے اور میدانِ جنگ میں تیغ و شمشیر کی جھنکار اور بوق و نائے کی آواز کے ساتھ ساتھ فردوسی کی رجز خوانی بھی مسموع ہوتی تھی۔ جب شاہ نامہ اس طرح ملک میں چاروں طرف اپنی ہر دل عزیزی کا سکہ بٹھا چکا ہو تو ظاہر ہے کہ عوام کو فردوسی کے حالات اور سوانح زندگی کی بھی تلاش ہوئی ہوگی۔
سلاطینِ اسلام کے دربار میں شعرا کا طبقہ ایک خاص امتیاز رکھتا تھا اپنے اقتدار کو ثبات اور ترقی دینے کی غرض سے اس جماعت نے ایک نئی قسم کے فلسفہ کی بنیاد ڈالی تھی جس میں بادشاہوں کی بقائے نام اور اس کی غیر فنائیت اپنے فرقے کی بہبود تربیت اور قدر شناسی کے

ضمن میں ثابت کی تھی۔ مختاری کہتے ہیں ؎

گرچہ مردم زعمر بر گزرست — عمر ثانی مدائحِ شعراست
زندہ رستم بشعرِ فردوسی ست — ورنہ زو در جہاں نشانہ کجاست
عنصری را ززرِّ محمودی — آں چناں شعرہائے بیش بہاست
جاں گدازی ست شاعری کردن — چوں بہا دادنش بصلہ سزاست
غرض از آفرینشِ شعرا — مدحتِ پادشاہ باشد راست

اس فرقے نے اپنی حفظ نوع کے لیے ایک ہتھیار بھی ایجاد کیا تھا جس کو اظہار خوشنودی اور انتقام کے وقت وہ استعمال کرتا تھا اس کا نام ہجو یا ہجایا مذمت تھا ان کا قول تھا ؎

کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا — بماند ہجا تا قیامت بجا

اسلام کی طاقتور سلطنتیں اگرچہ یوں تو ان کی وسیع طاقت کی قانون انسانی یا قانون الٰہی بھی حد بندی نہیں کر سکتا تھا لیکن شعرا ان کے ہاں ہی سے اپنا زبردست اقتدار اور اثر قائم کر چکے تھے اُنھوں نے اپنے بارے میں ان شاہانہ اور مستبدانہ اختیارات کو بہت کچھ معتدل کر دیا تھا۔ اتفاق سے محمود اور فردوسی کے ناخوش گوار تعلقات کا راوی بھی یہی طبقہ ہی کیونکہ ہم عصر تاریخیں اس مقدمے میں بالکل خاموش ہیں۔ اس جماعت نے اس قصے میں اپنی تعلیم کی تائید کے حق میں نہایت ضروری اجزا پائے، اس کی شہرت میں اپنی حفاظت کا سامان دیکھا اس لیے اس افسانے کو انھوں نے بہت کچھ آب و تاب دے کر مختلف رنگ آمیزیوں کے ساتھ ہر موقع پر بیان کرنا شروع کیا۔ محمود اگرچہ اسلام کے طاقتور اور اولوالعزم بادشاہوں میں سے ہی مگر فردوسی

کے انتقام نے اُس کو ہمیشہ کے لیے نگاہوں میں ذلیل کر دیا ہی وہ ہر
سلطان اور امیر کے لیے سبقِ عبرت بنایا گیا ہی کہ شعرا کے ساتھ سلوک
مرعی رکھنے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے ورنہ کہیں وہی حشر نہ ہو جو
محمود غزنوی کا ہوا۔ محمود اور فردوسی کا افسانہ بار بار دوہرایا گیا اور سنایا
گیا اس صورت میں، ہجو کی ہر طرف تلاش کی گئی ہوگی، ہر شخص اس کے
دیکھنے اور پڑھنے کا مشتاق ہوگا، اگرچہ شروع میں لوگ یہی کہتے رہے
کہ وہ غائب ہوگئی، لیکن یہ امر انسانی بالخصوص شاعر کی طبیعت کے
منافی تھا کہ ہجو کا فقدان ہمیشہ کے لیے مانا جائے۔ فردوسی اگرچہ موجود
نہیں تھا فردوسی کے ہم مشرب ہر وقت اور ہر زمانہ میں موجود تھے آخر
کار ان کی کوششوں نے اس گوہرِ گم گشتہ کو بھی پیدا کر لیا اور رفتہ رفتہ
شاہ نامہ کے ہر نسخہ کے ساتھ شائع ہونے لگی حتیٰ کہ اس کا اصلی جزو
بن گئی۔ متاخرین نے کبھی اس کی مصنوعی ہستی کا احتمال تک نہیں کیا۔
اور آج یہ جعلی نمونہ اسی قدر فردوسی کا اصلی کلام مانا جاتا ہی جیسے فردوسی
کا اور صحیح کلام۔ عوام النّاس شاہ نامہ سے واقف نہیں لیکن ہجو کے
شعار سے بچّہ بچّہ تک آگاہ ہی۔ ہجو کی مقبولیت اس میں شک نہیں
شاہ نامہ کی مقبولیت سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہی اور ہم جو کہ اس
عام غلطی اور ایک غیر تاریخی واقعے کی تکذیب میں قلم اٹھا رہے ہیں
اُس کے افشا کرنے سے خود متالم اور متفکر معلوم ہوتے ہیں کیونکہ
جس مقبولہ اور عام غلطی میں ہم نے پرورش پائی ہی اس کے ابطال
کو ہمارا دل گوارا نہیں کرتا۔

حقیقت یہ ہی کہ فردوسی کے افسانے جو اسلاف نے ترکہ میں ہم

تک پہنچائے ہیں کچھ ایسے دل کش خوش آیند اور دل فریب ہیں کہ اُن
کی تصدیق سے انکار کرنے کو ہمارا دل نہیں مانتا۔ ہم ایک طرف ایک
جلیل القدر نوجوان سلطان کو دیکھتے ہیں جس کے اشارۂ چشم پر لاکھوں
تلواریں ایک دم میں برہنہ ہو سکتی ہیں اور لاکھوں سر بے دوش ہو سکتے
ہیں جو انسانی طاقت کے انتہائی معراج پر ہے اور طیش میں ہے' اس کے
مقابلے میں ایک پیرِ منحنی کو دیکھتے ہیں جس کا جسم بھی اس کے قابو میں
نہیں۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک قلم ہے۔ غصہ نے اس کے ابروؤں
پر شکن ڈال دی ہے۔ اِس جنگ میں کون جان سکتا تھا کہ بوڑھے کی
فتح ہوگی مگر ایسا ہی ہوُا۔ یہ بوڑھا ماہر اپنے قلم سے صفحۂ قرطاس پر
کچھ لکھتا نظر آتا ہے اور کسی قریب کے آدمی کے ہاتھ میں وہ کاغذ
دے کر بغیر کسی سمت نظر ڈالے رُخصت ہو جاتا ہے۔ قلم شمشیر سے
زیادہ طاقتور ہے۔ اس مقولہ کا ثبوت اس جنگ جذبات میں ملتا ہے۔
جب اس کاغذ پر سلطان نظر ڈالتا ہے تو غصّے سے آتش و شعلہ بن جاتا ہے
وہ اِس بوڑھے کی گرفتاری، قتل اور ہلاکت کا حکم دیتا ہے لیکن بوڑھا گویا
غزنین سے پر لگا کر اُڑ گیا تھا نہ ملا پر نہ ملا۔ فردوسی دارالسلام بغداد
پہنچ چکا تھا اور محفوظ تھا۔ آتش مزاج سلطان اپنی طاقت کا اندازہ
کر کے امیر المومنین کے خلاف بھی اعلانِ جنگ کر دیتا ہے اور بغداد کی
خاک کو ہاتھیوں پر لدوا کر غزنین منگوانے کی دھمکی دیتا ہے لیکن فردوسی
حوالہ نہیں کیا جاتا۔ اس طرف فردوسی کی ہجو اپنا کام کر رہی ہے وہ آتشِ صحرا
کے مانند سُرعت کے ساتھ شہر بشہر قصبہ بہ قصبہ کوچہ بہ کوچہ خانہ بخانہ
پھر رہی ہے اسے جوان بھی پڑھتے ہیں بوڑھے بھی پڑھتے ہیں اور بچے

بھی جانتے ہیں۔ نوجوان سلطان با ایں ہمہ جلال و شوکت اس خوف ناک انتقام کے لیے مستعد نہیں تھا اس کا غصّہ کافور ہو جاتا ہے وہ پشیمان ہوتا ہے۔ تلافیِ مافات اور فردوسی سے معافی مانگنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور ظفر فردوسی کے پرچم پر لہراتی ہے۔ فردوسی کی حسرت ناک موت اور انعام کی بے وقت آمد بھی کچھ ایسا درد خیز واقعہ ہے کہ ہم اس سے انکار کرنے کے لیے تیار نہیں معلوم ہوتے۔ ہم میں قدرتاً غرائب پسندی کا مادہ موجود ہے اور یہی پسند آتا ہے کہ فردوسی ایک غیر معمولی آدمی تھا۔ اس غیر معمولی آدمی کی موت بھی غیر معمولی طریقے سے ہونا چاہیے۔ ہم کو اسی میں لطف ملتا ہے کہ فردوسی کے لیے ایسی مرگ پسند کریں اور پھر درد کے مزے لے لے کر اور ہاتھ مل مل کر کہیں ع

نوش دارو کہ پس از مرگ بسہراب دہند

عجوبہ پسند طبائع سے اگر یہ کہا جائے کہ فردوسی کے حالات جو اسلاف نے ہمارے لیے ودیعت چھوڑے ہیں تاریخی افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تو وہ ہرگز ہرگز باور نہیں کریں گے سچ تو یہ ہے کہ ہم اپنے بچپن کے سبق کو جوانی اور بڑھاپے میں بھولنا نہیں چاہتے عام اس سے کہ ہماری شاہراہ ہم کو ترکستان لے جائے یا کعبے۔ وہ تاریخی اغلاط جو ہمارے ادب کی روح و رواں بن گئی ہیں اور صدیوں سے جن پر ہماری نسلوں نے تعلیم پائی ہے ہم کیونکر گوارا کر سکتے ہیں کہ طشت از بام ہوں۔ لیکن تاریخ اور ہے اور افسانہ اور ہے اور مورخ کو اپنے تلخ فرائض بھی ادا کرنے چاہئیں۔

یہاں میں ہجو کی تعمیر و ترتیب کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول

کرنا چاہتا ہوں مختلف نسخوں میں ہجو کے اشعار دو عنوان سے شروع ہوتے ہیں ؎

(الف) ایا شاہ محمود کشور کشائے — زکس گر نہ ترسی بترس از خدائے

(با) الا ای خردمند صاحب خبر — بگفتار و کردار من در نگر

"ہجو الف" ایک سو دو ابیات ہیں۔ بمبئی اور نول کشوری نسخوں میں ان کی تعداد ایک سو پانچ ہے۔ "ہجو با" میں ایک سو چونتیس اشعار نظر آتے ہیں۔ قاضی نور اللہ شوستری مجالس المومنین میں پوری ہجو نقل کرتے ہیں لیکن ان کے ہاں کُل اُنتّر ابیات ہیں۔ ایک قلمی نسخہ میں جو نویں صدی ہجری کی ابتدا سے تعلق رکھتا ہے اڑتیس بیت پائے جاتے ہیں اور وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہجو کے متعلق ہر شاہ نامہ میں کچھ نہ کچھ اختلاف کمی بیشی ملے گی اور اگر ان تمام اختلافات کو جمع کیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ کُل ابیات کی تعداد دو سو سے زائد ہو جائے گی۔

قاضی نور اللہ شوستری کے ہاں اگرچہ ہجو کے اشعار کی تعداد بہت کم ہے تاہم مندرجۂ ذیل وہ اشعار ہیں جو کلکتہ کے شاہ نامہ میں نہیں ملتے ؎

چو سلطانِ دیں بد نبی و علی — (۱) بفرِّ الٰہی و شانِ یلی

زلالِ رواں بخش آں نظمِ پاک — (۲) در آتش فگند و نیاورد باک

اگرچہ شود کشتہ آتش ز آب — (۳) ولیکن شد آں آب ز آتش خراب

یہ دو شعر دیباچۂ بایسنغر خانی کے متن میں منقول ہیں۔ معلوم نہیں قاضی صاحب نے انھیں ہجو میں کیوں شامل کر دیا ؎

چو قولِ شہ از جود نوشت نخ — (۴) حدیثِ نقع را نوشتم بہ تخ

جہاں را چنیں ست آئین و ساز — (۵) کہ سازد فرومایہ را سرفراز

ستاند ز خاک و رساند بتخت (۶) کند یار مندش بہ نیروئے بخت
نداند نکوئی شود ناسپاس (۷) نہ باشد خداوند را حق شناس
یہ تینوں شعر کسی نسخہ میں نظر سے نہیں گزرے ؎

اگر در کفِ پلاۓ پیلم کُنی (۸) تنِ ناتواں ہم چو نیلم کُنی
یہ شعر معلوم نہیں کلکتہ شاہ نامہ اور اس کی تقلید میں بمبئی اور نول کشوری شاہ نامہ سے کیوں خارج کر دیا گیا۔ خواجہ حسن میمندی کی ہجو میں قاضی نور اللہ کہتے ہیں کہ فردوسی نے یہ اشعار لکھے ؎

بدل ہر کہ بغضِ علی کرد جاے (۹) ز مادر بود عیبِ آں تیرہ راے
کہ ناپاک زادہ بود خصمِ شاہ (۱۰) اگر چند باشد بایوان و گاہ
ز میمندی آئینِ مردی مجوے (۱۱) ز نام و نشانش مکن جستجوے
قلم بر سرِ او بزن ہمچو من (۱۲) کہ گم باد نامش بہر انجمن
اِن کا پتہ کسی نسخہ میں نہیں چلتا۔ دیباچۂ بایسنغری میں البتہ درج ہیں اور اگرچہ فردوسی کی طرف منسوب ہیں ہمارا عقیدہ ہے کہ ان کی تصنیف کا حق صاحب دیباچہ ہی کو حاصل ہے۔ ہجو الف میں مندرجۂ ذیل ابیات ایسے ہیں جو ہجو با میں نہیں ملتے ۔

کہ پیش از تو شاہاں فراواں بدند (۱) ہمہ نام دارانِ گیہاں بدند
فزوں از تو بودند یکسر بجاہ (۲) بگنج و سپاہ و بہ تخت و کلاہ
نہ کردند جز خوبی و راستی (۳) نگشتند گرد کم و کاستی
ہمہ داد کردند بر زیر دست (۴) نبودند جز پاک یزداں پرست
نجستند از و ہر جز نامِ نیک (۵) وزاں نام جستن سرانجام نیک
ہر آں شہ کہ در بندِ دینار بود (۶) بہ نزدیک اہلِ خرد خوار بود

چہ گفت آں خداوند تنزیل وحی (۷) خداوند امر و خداوند نہی

کہ من شہر علمم علیم درست (۸) درست ایں سخن قولِ پیغمبر است

گواہی دہم کیں سخن رازِ اوست (۹) تو گوئی دو گوشم برآوازِ اوست

چو باشد ترا عقل و تدبیر و رائے (۱۰) بہ نزدِ نبی و علی گیر جائے

گرت زیں بد آید گناہِ من است (۱۱) چنین ست و ایں رسم و راہِ من ست

ابا دیگراں مر مرا کار نیست (۱۲) بدیں در مرا جائے گفتار نیست

چو بر تختِ شاہی نشاند خدائے (۱۳) نبی و علی را بدیگر سرائے

من ایں نامۂ شہریارانِ پیش (۱۴) بگفتم بدیں نغز گفتارِ خویش

ازاں گفتم ایں بیت ہائے بلند (۱۵) کہ تا شاہ گیرد ازیں کار پند

کزیں پس بداند چہ باشد سخن (۱۶) باندیشد از پندِ پیرِ کہن

دگر شاعراں را نیازاردا و (۱۷) ہماں حرمتِ خود نگہ داردا و

کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا (۱۸) بماند ہجا تا قیامت بجا

بنالم بدرگاہِ یزدان پاک (۱۹) فشانندہ بر سر پراگندہ خاک

کہ یارب روانش بآتش بسوز (۲۰) دلِ بندۂ مستحق بر فروز

بمبئی اور نول کشوری نسخوں میں یہ تین شعر ملتے ہیں ؎

کہ سفلہ خداوندِ ہستی مباد (۱) جواں مرد را تنگ دستی مباد

(قاضی نور اللہ کے ہاں بھی یہ بیت موجود ہے) ؎

چو پروردگارش چنیں آفرید (۲) نیابی تو بر بندِ یزداں کلید

بزرگی سراسر بگفتار نیست (۳) دو صد گفتہ چوں نیم کردار نیست

ہجو میں اشعار کی تعداد سب سے زیادہ ہے جیسا کہ اوپر گزارش ہو چکا ہے ابیات آئندہ اس میں ایسے ہیں جو ہجو الف سے غیر حاضر ہیں ؎

الا اے خردمند صاحب خبر (۱) بگفتار و کردار من در نگر
میانجی میانِ من و شاہ باش (۲) بحقِ خدا گر ز حق آگاہ باش
مرا نظم شہنامہ فرمود شاہ (۳) دراں دم کہ بنشست شاداں بگاہ
کہ بخشد ز ہر بیت زر یک درم (۴) ہر آنچ آورم نظم از بیش و کم
بشش بیور ایں نامہ و شش ہزار (۵) بگفتم نہ کرد ایچ در من نظار
حسد برد بدگوے در کارِ من (۶) تبہ کرد بر شاہ بازارِ من
سخن ہائے شایستۂ غم گسار (۷) بگفتار بد گوے بگذاشت خوار
چو بر باد دادند رنجِ مرا (۸) نبد حاصلے سی و پنج مرا
چنیں شہریارے و بخشندۂ (۹) بگیتی ز شاہاں درخشندۂ
بدیں گونہ بگزشت از قولِ خود (۱۰) برآورد بر قولِ خود بولِ خود
نہ ممسک بُدے ایں پادشاہ و نہ زفت (۱۱) کہ از وے کم ایں سخن ہا شنفت
چو قولِ شہ از جود بنوشت نخ (۱۲) حدیثِ فقع بر نوشتم بنخ
چو گفتارِ شہ می کند زر بسیم (۱۳) نباشد ہمی نامِ او جز لئیم
نژادش چو از بیخ شاہی نرست (۱۴) بگفتار زینساں بود نادرست
شہے را کہ از طبع درویش بود (۱۵) بشہنامہ او را نشاید ستود
نمیرم ازیں پس کہ من زندہ ام (۱۶) کہ تخمِ سخن را پراگندہ ام
نمردست و ہرگز نمیرد سخن (۱۷) سخنداں ز من ایں سخن ہا فہم کن
چنیں گفتہ بد او کہ بودہ است گیو (۱۸) ہماں رستم و طوس و گودرز نیو
مرا در جہاں شہریارے نو است (۱۹) یسے بندگانم چو کیخسرو است
نہ خسرو نژادے نہ والاسرے (۲۰) پدر نز اصفہاں بود آہنگرے
اگرچند بودند آہنگراں (۲۱) بہ از شاہ بدشاں نژادِ گراں

گر او را نبودے نژاد اندرش (۲۲) تہمتن نہ دادے بدو دخترش

مرا ایں نامۂ شہریاراں بخواں (۲۳) سر از چرخِ گردوں ہمی بگزراں

کہ آں شہریاراں چو تو شہریار (۲۴) بسے بود شاں بیگماں بیش کار

نگشتند ہرگز بگفتارِ خویش (۲۵) بہشتند مردم ز آزار خویش

چو ایں نامور نامہ آمد بہ بن (۲۶) پشیماں شد از گفتہائے کہن

کرم بیں بہ نزدیک شاہ فقیر (۲۷) بگوے وز گفتارِ حق وا مگیر

نہ نیکو بود حق نگہ داشتن (۲۸) بخاشاک ایماں بر انباشتن

ازاں گفتم ایں را کہ تا انجمن (۲۹) نجو یند ازیں گفتہا عیبِ من

خرد نیست مر شاہ محمود را (۳۰) کہ بینم دلش مانعِ جود را

حدیثِ پیمبر نگشتست رد (۳۱) شود ہر شئی راجعِ اصل خود

نہ محمود غزنیں کہ محبوبِ حق (۳۲) ز شاہنشہاں بردے بے شک سبق

شہنشاہ محمود کاندر جہاں (۳۳) ور اشیر یزداں بود پہلواں

نکردی تو در نامۂ من نگاہ (۳۴) کہ روزے نبودت نکوئی ز شاہ

بگفتا حسن کر پزیادہ گوے (۳۵) نشاید شنیدن سخن زشت اوے

صد افسوس دارم ز عمرِ عزیز (۳۶) کہ ممدوح گشتم بر آں بے تمیز

بگفتار بدگوے ایں نام بد (۳۷) پذیرفتی و بدنہادی بخود

مرا نام بادا ترا گنج و مال (۳۸) کہ ایں جاودانست وآں پائمال

ولیکن چو دارندۂ لم یزل (۳۹) قلم رانده بد ایں چنیں در ازل

نیاید ز ما با قضا چارۂ (۴۰) نسودے کند ہیچ بیچارۂ

اگر گشت ویراں بدیں شاہ گنج (۴۱) مرا گشت آباد گنجم ز رنج

کہ نزدِ خداوندِ جاں آفریں (۴۲) بسے می برم زیں جہاں آفریں

شفیعم محمد رفیقم علی ست (۴۳) امامم علی و ولیم نبی ست
اگر دوست داری تو آلِ رسول (۴۴) سخن اُفتدت در محلِّ قبول
ترا بس بود گفتنم یاد گیر (۴۵) بدار البقا جائم آباد گیر
مرا ان از دلت مهر آلِ نبی (۴۶) مکن خویشتن را از ان اجنبی
خدایا تو این بنده را دستگیر (۴۷) بہ بخشائے تقصیر این مرد پیر
نخواہم ز دنیائے مردم گزائے (۴۸) تن آباد دارم بہ دیگر سرائے
روانِ مرا در مقامِ صفا (۴۹) فرود آر در حضرتِ مصطفا
تن آسانم از عقدہا بگزران (۵۰) بایماں ز جسمم بدا ور رساں
من و ہر کہ از دوستدارِ من ست (۵۱) بمہرِ محمد دلش روشن ست
الٰہی باعزازِ آلِ عبا (۵۲) کہ مارا مجدد بہ بخشد خطا
ز فردوس اعلیٰ بزیرِ لوا (۵۳) بہ بخشائے آں جائے مارا بقا
ہزاراں ہزاراں ہزار آفریں (۵۴) ز ما بر محمدؐ و آل اجمعیں

ہجو باؔ

قبل ازیں گزارش ہو چکا ہی کہ ہجو باؔ سب سے زیادہ نشو و نما یافتہ مرحلہ ہی۔ سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہی کہ یہ نظم نہایت مسلسل اور مکمل ہی برخلاف ہجو الف کے جس میں ترتیب اور ربط کی ضرورت قدم قدم پر محسوس ہوتی ہی۔ واقعات کے لحاظ سے اس کے بیانات نہایت عجیب و غریب طریقے سے دیباچہ بایسنغر خانی کے مقالات کی تائید اور تقویت کر رہے ہیں اور یہی تائید ہی جو سب سے پہلے ہمیں شبہہ میں ڈالتی ہی کہ کہیں دیباچہ کے بیانات پڑھ کر کسی نے اس کو نظم

نہ کر دیا ہو۔ تمہید کے ابتدائی اشعار ہیں ؎

الا ای خردمند صاحب خبر — بگفتار و کردارِ من در نگر
میانجی میان من و شاہ باش — بحق خدا اگر ز حق آگاہ باش
مرا نظم شہنامہ فرمود شاہ — در آں دم کہ بنشست شاداں بگاہ
کہ بخشد بہر بیتِ زر یک درم — ہر آنچ آورم نظم از بیش و کم
بسی سال و پنج از سرای سپنج — چنیں رنج بردم بامیدِ گنج
بشش بیور ایں نامہ و شش ہزار — بگفتم نہ کرد ایچ در من نظار

مقصد یہ ہی کہ جب پادشاہ تخت نشین ہوا اس نے مجھ کو شاہ نامہ کی نظم پر مامور کیا کہ جو کچھ میں نظم کروں فی شعر ایک دینار کے حساب سے مجھ کو اجرت ملے اس لیے انعام کی امید میں پینتیس سال میں نے کام کیا چھیاسٹھ ہزار اشعار لکھے لیکن اُس نے میری طرف توجہ ہی نہیں کی یہاں دعویٰ کیا گیا ہی کہ شاہ نامہ سلطان کی تخت نشینی کے وقت شروع ہوا جو واقعہ ۳۸۷ھ یا ۳۸۸ھ میں ظہور پذیر ہوا اس پر اگر پینتیس سال اضافہ کیے جائیں تو گویا ۴۲۲ھ یا ۴۲۳ھ میں شاہ نامہ ختم ہوا لیکن اس تاریخ سے ایک یا دو سال قبل سلطان محمود غزنوی یعنی ۲۳ ربیع الاول ۴۲۱ھ ہجری کو وفات پا چکا ہی۔ اب فردوسی مردہ سلطان کی ہجو لکھنے سے رہا۔ شاہ نامہ بقول فردوسی سنہ ۴۰۰ میں ختم ہوا۔ اب ظاہر ہی کہ ہجو کا بیان فردوسی کے قلم سے نہیں نکلا۔ علاوہ بریں شہادتِ کلام سے بھی ہم کچھ اسی قسم کا نتیجہ نکالتے ہیں نہ وہ فردوسی کی زبان ہی اور نہ اس کا انداز۔ "صاحب خبر" اور "حق خدا" کی ایسی ترکیبیں ہیں جو فردوسی کے ہاں رائج نہیں۔ آخری دو شعر قریب شاہ نامہ سے لیے گیے ہیں۔ ؎

نہ کرد اندریں داستانم نگاہ　　بگفتارِ بدگوئے گم کردہ راہ
حسد بُرد بدگوے در کارِ من　　تبہ کرد بر شاہ بازارِ من
سخن ہائے شایستۂ آبدار　　بگفتارِ بدگوے بگزاشت خوار

آخری مصرع کے علاوہ باقی ڈھائی شعر شاہ نامہ سے ماخوذ ہیں ؎

چو بر باد دادند رنجِ مرا　　نبُد حاصلے سی و پنج مرا

شاہ نامہ سے نقل کیا گیا ہے ؎

چنیں شہریاری و بخشندۂ　　بگیتی ز شاہاں درخشندۂ
بدیں گونہ بگزشت از قولِ خود　　برآورد بر قولِ خود بولِ خود
نہ ممسک بدے ایں پادشاہ و نہ زفت　　کہ از وے کم ایں سخن ہا شنفت
جو قولِ شہ از جود بنوشت نخ　　حدیثِ فقع بر نوشتم بہ یخ

پہلا شعر شاہ نامہ سے منقول ہے دوسرے شعر میں قول اور بول ایسے الفاظ ہیں جن کو فردوسی استعمال نہیں کرتا "از قولِ خود بگزشت" لالہ بھائیوں کا محاورہ معلوم ہوتا ہے۔ بر قولِ خود بول برآوردن ایک عجیب محاورہ ہے کہ یہاں کے سوا کسی فارسی کتاب میں اس کا پتہ نہیں چلے گا۔ بہر حال فردوسی کے لیے ایسی گندی زبان استعمال کرنا ناممکن تھا۔ تیسرے اور چوتھے شعر میں ممسک، قول، جود، حدیث، اس قدر عربی الفاظ ہیں کہ فردوسی کا کلام نہیں کہا جا سکتا۔

چو گفتارِ شہ می کند زر بسیم　　بنا شد ہمیں نام او جُز لئیم

زر بسیم می کند اس کا کیا مطلب ہوا کیا یہ فارسی ہے اور کیا یہ فردوسی کی زبان ہے۔ اس شعر میں چونکہ سلطان کو دینار کا وعدہ کر کے درم دینے پر مستعد دکھایا جاتا ہے جو بالکل امر خلاف واقع ہے اس لیے ثابت ہے کہ

وہ ملحقات سے ہے؎

نژادش چو از بیخ شاہی نرست | بگفتار زیں ساں بود نادرست

یہ شعر بالکل کمزور ہے پہلے مصرعہ میں جس قسم کا تکلف ہے فردوسی اس کا عادی نہیں اس کی سادگی کی مثال اس مصرع میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ع

نژادِ من از پشتِ گشتاسپ ست

اس شعر کے بیانات بھی خلاف واقع ہیں محمود اس میں شک نہیں کہ امیر ناصر الدین سبکتگین کا فرزند تھا امیر مذکور خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو محمود کے لیے علاوہ ذاتی نجابت کے یہ شرافت کافی ہے کہ وہ ایک بادشاہ کا بیٹا ہے اور کون ایسا بادشاہ ہوا ہے جو ہمیشہ سے پوتڑوں کا رئیس چلا آیا ہے؎

نمیرم ازیں پس کہ من زندہ ام | کہ تخمِ سخن را پراگندہ ام
نمرد است وہرگز نمیرد سخن | سخنداں زمن ایں سخن فہم کن

پہلا ڈیڑھ شعر شاہ نامہ سے ہے۔ آخری مصرع کی تصنیف ملحقات سے جاننا چاہیے؎

چنیں گفتہ بد او کہ بودہ است گیو | ہماں رستم وطوس وگودرز نیو
مرا در جہاں شہریارے نو است | بسے بندگانم چو کیخسرو است
نہ خسرو نژادے نہ والا سرے | پدرش از صفاہاں بد آہنگرے
اگر چند بودند آہنگراں | بہ از شاہ شاں بد نژاد گراں
گر او را نبودے نژادا اندرش | تہمتن ندادے بدو دخترش

یہ اشعار غالباً تلمیح کرتے ہیں محمود کے کسی اعتراض کی طرف جو اس نے ہم سمجھتے ہیں گیو کی آہنگر نژادی پر کیا ہوگا اور صاحب ہجو گیو کا سلطان سے مقابلہ کر کے دعویٰ کرتا ہے کہ گیو اگرچہ لُہار تھا تاہم بادشاہ سے

اچھی نسل کا تھا۔ اگر اس کی ہڈی میں کوئی داغ ہوتا تو رستم اپنی بیٹی اس کو کیوں دیتا۔ اس واقعے کا چرچا کسی تاریخ میں نہیں ملتا۔ نہیں معلوم یہ گم نام مصنّف کس سند کی رو سے اس کا ذکر کرتا ہے البتہ نخسرو شہزادے نوالا سرے الخ شاہ نامہ میں ملتا ہے ؎

مرایں نامۂ شہریاراں بخواں | سراز چرخِ گردوں ہمی بگزراں

اس شعر کا پہلا مصرع شاہ نامہ سے لیا گیا ہے۔ مصرع دوم برائے بیت ہے۔ شاہ نامہ میں یہ شعر یوں واقع ہوتا ہے ؎

یکے نامۂ شہریاراں بخوان | نگرتا کہ باشد چو نوشیروان

؎ کہ آں شہریاراں چو تو شہریار | بسے بود شان بیگمان بیش کار

نگشتند ہرگز ز گفتارِ خویش | بہشتند مردم ز آزارِ خویش

ان اشعار کو ملحقات سے تصوّر کرنا چاہیے اِن کی بندش کی کمزوری بغیر نشان دہی معلوم کی جا سکتی ہے ؎

چو ایں نامور نامہ آمد بہ بن | پشیماں شد از گفتہائے کہن

یہ شعر شاہ نامہ کے دو مختلف شعروں سے ماخوذ ہے۔

چو ایں نامور نامہ آمد بہ بن (۱) زمن روئے کشور بشد پر سخن

چو بشنید شہ از پشوتن سخن (۲) پشیماں شد از کردہائے کہن

؎ کرم بیں بہ نزدیکِ شاہِ فقیر | بگوے و ز گفتارِ حق وا بگیر

یہ شعر تو ہمیں لالہ بھائیوں کی فارسی کی یاد دلاتا ہے۔ معاذ اللہ اگر یہ زبان فردوسی کی مانی جائے۔ کرم، فقیر اور حق ایک شعر میں تین عربی الفاظ موجود ہیں ؎

نہ نیکو بود حق نگہ داشتن | بخاشاک ایماں برانباشتن

ازاں گفتم ایں را کہ تا انجمن نگویند از یں گفتہا عیب من

اس حق نگہ داشتن کے کیا معنی، مطلب تو میں سمجھ گیا کہ سچی بات چھپانا اچھا نہیں ہوتا میرے خیال میں نہاں داشتن موزوں معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال یہ ہندستانی فارسی ہے اس سے زیادہ تنقید کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی ہے۔

خرد نیست مر شاہِ محمود را کہ بینم دلش مانع جود را

آخری مصرعہ میں را کا استعمال قائل کی عدم استعداد کا پردہ فاش کر رہا ہے ۔

حدیثِ پیمبر نگشت ست رد شود ہر شیٔ راجع اصلِ خود

یہ حدیثِ نبوی کا ترجمہ ہے کہ کُلّ شیٍٔ یرجعُ اِلیٰ اصلہٖ۔ اس کی بندش کی کمزوری بغیر بتائے معلوم ہو رہی ہے اور ہم اس کو ملحقات سے مانتے ہیں ۔

نہ محمود غزنی کہ محبوب حق زشاہنشہاں برد بیشک سبق

شہنشاہ محمود کاندر جہاں ورا شیر یزدان بود پہلواں

یہ اشعار اس شیعی نقطۂ خیال کی غیر مترقبہ تائید کر رہے ہیں جس کے بظاہر قاضی نور اللہ شوستری بانی ہیں۔ یہ خیال اگرچہ شیعہ حلقوں میں قاضی مرحوم کے زمانہ سے پیشتر کا ہے کہ فردوسی نے شاہ نامہ رسول اللہؐ اور حضرت علیؓ کے نام پر لکھا ہے جیسا کہ یہ شعر مظہر ہے۔

بنامِ نبی و علی گفتہ ام گہرہائے معنی بسے سفتہ ام

اِس عقیدے کی تردید کی چنداں ضرورت معلوم نہیں ہوتی اِس لیے کہ شاہ نامہ خود اس کی تردید کر رہا ہے "محبوبِ حق" اور "شہنشاہِ محمود" سے مراد رسول اللہ ہیں "شیر یزداں" "اسد اللہ الغالب" کا ترجمہ

کیا گیا ہے اور حضرت علیؑ مراد ہیں۔ اشعار کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب محمود غزنوی کے نام پر نہیں لکھی گئی بلکہ رسول اللہ کے نام پر جن کے پہلوان حضرت علی ہیں۔ ۵

نہ کردی تو در نامۂ من نگاہ — کہ روزے نبودت نکوئی زشاہ
بگفتا حسن کر بزیادہ گوے — نشاید شنیدن سخن زشت اوے
صد افسوس دارم زعُمرِ عزیز — کہ ممدوح گشتم براں بے تمیز

اِن اشعار کی لغویت اور زبان کی کمزوری بغیر ہماری نشان دہی کے معلوم کی جاسکتی ہے۔ پہلا مصرع شاہ نامہ سے لیا گیا ہے۔ جو یوں ہے۔ نہ کرد اندریں داستاں ہا نگاہ۔ دوسرے مصرع میں شاہ کا لفظ برائے بیت نہیں بلکہ برائے قافیہ لایا گیا ہے۔

اِن اشعار کی زبان اِس قدر بھدی اور بے ربط ہے کہ معمولی فارسی خواں کو بھی اس سے شرم آئے گی۔ ممدوح کے معنی میں اس ماہرِ فن نے توسیع دے دی ہے جس کی سند پر ہم اس کو بمعنی مادح استعمال کر سکتے ہیں۔ دروغ گو را حافظہ نہ باشد۔ نہایت سچی مثل ہے اور اس کا مصداق یہ بیان ہے جو حسن میمندی کے نام پر کیا گیا ہے۔ یہاں یہ ہجو نگار اسی عام غلطی کا شکار ہے جس میں صاحب دیباچۂ بایسنغر خانی قاضی نور اللہ شوستری اور علامہ شبلی پڑے ہوئے ہیں۔ وہ یقین کرتے ہیں کہ حسن میمندی سلطان کا وزیر تھا۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے حسن میمندی سبکتگین کے زمانہ میں مارا جا چکا ہے اور اس کا فرزند خواجہ احمد بن حسن میمندی سلطان کا وزیر تھا۔ اب یہ خیال کرنا کہ فردوسی کو بھی وہی عام مغالطہ ہو گیا جو اور تذکرہ نگاروں کو ہو گیا ہے ناممکن ہے۔ ۵

بگفتار بد گوے ایں نام بد | پذیرفتی و بد نہادی بخود
مرا نام بادا ترا گنج و مال | کہ ایں جاودانست آں پایمال

بد بر خود نہادن کون سا محاورہ ہے۔ ان دونوں اشعار کو ملحقات میں ماننا ہوگا۔ ۵

ولیکن چو دارندۂ لم یزل | قلم راندہ بد ایں چنیں از ازل
نباید زما با قضا چارۂ | نہ سودے کند ہیچ پتیارۂ
اگر گشت ویراں بدیں شاہ گنج | مرا گشت آباد گنجم ز رنج
کہ نزدِ خداوندِ جاں آفریں | بسے می برم زیں جہاں آفریں
شفیعم محمد رفیقم علی ست | امامم ولی و ولیم نبی ست
اگر دوست داری تو آلِ رسول | سخن اُفتدت در محلِّ قبول
ترا بس بود گفتنم یاد گیر | بدار البقا جایم آباد گیر
مراں از دلت مہرِ آلِ نبی | مکن خویشتن را از آں اجنبی
خدایا تو ایں بندہ را دستگیر | بہ بخشائے تقصیر ایں مرد پیر
نخواہم ز دنیائے مردم گزائے | تن آباد دادم بدیگر سرائے
روانِ مرا در مقامِ صفا | فرود آر در حضرتِ مصطفا
من و ہر کہ از دوستدارِ من ست | بمہرِ محمد دلش روشن ست
الٰہی باعزازِ آلِ عبا | کہ مارا مجدد بہ بخشا عطا
ز فردوسِ اعلیٰ بزیرِ لوا | بہ بخشائے آں جائے ما را بقا
ہزاراں ہزاراں ہزار آفریں | زما بر محمد و آل اجمعیں

اِن اشعار کے متعلق صرف اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ نہ وہ فردوسی کی زبان ہے اور نہ فردوسی کے خیالات ہیں۔ اور نہ اس کا عقیدہ ظاہر

کرتے ہیں۔ میں ان کو بلا کسی پس و پیش کے ملحقات میں شمار کرتا ہوں۔

ہجو الف کے جو اشعار ہجو بابیں نہیں ملتے اس کی وجہ یہی ہے کہ ہجو با کے مصنّف نے اس سے جہاں تک ہو سکا ان تمام اشعار کو سلسلہ وار مرتّب کیا لیکن جن اشعار سے سلسلہ قایم نہیں رہتا تھا یا جو دیباچہ میں ملتے تھے۔ مثلاً حضرت علی کی شان میں اشعار وغیرہ اس نے ترک کر دیے۔

ہجو الف

ایا شاہ محمود کشور کشا — زکس گر نہ ترسی بترس از خدا

کہ پیش از تو شاہاں فراواں بدند — ہمہ تاجداران گیہاں بدند

یہ یاد رہے کہ ان دونوں شعروں میں کافی ربط نہیں پایا جاتا اصل میں ہمارے خیال میں صاحب ہجو نے پہلے شعر کے بعد یہ شعر لکھا تھا۔

کہ بد دیں و بدکیش خوانی مرا — منم شیر نر میش خوانی مرا

اب دونوں شعر باہم خوب چسپاں ہوتے ہیں۔

فزوں از تو بودند یکسر بجاہ — بگنج و سپاہ و بہ تخت و کلاہ

مصرع آخر شاہنامہ سے لیا گیا ہے۔ چنانچہ۔

ز فرہاد و گیو و برآرم بجاہ — بگنج و سپاہ و بہ تخت و کلاہ

؎ نہ گردند جز خوبی و راستی — نگشتند گرد کم و کاستی

میرے خیال میں پچھلے مصرع میں "کمی" بجائے "کم" آنا چاہیے تھا۔
چنانچہ فردوسی ؎

ہنر مردمی باشد و راستی — ز کژّی بود کمّی و کاستی

یہ شعر اگرچہ بہت کچھ شاہ نامہ کے رنگ میں ہے لیکن ایک فرق ہے کہ کم و کاستی کے بجائے فردوسی اکثر "کژی و کاستی" لکھتا ہے اور اس کے قریب قریب اشعار شاہ نامہ میں حسب ذیل ہیں:۔

بجوید بجز خوبی و راستی (۱) نیارد بداد اندروں کاستی

نبد در دلش کژی و کاستی (۲) بجستے بجز خوبی و راستی

نجستم ہمیشہ جز از رستی (۳) زمن دور بد کژی و کاستی

نجستی جز از کژی و کاستی (۴) نہ کردی بہ بخش اندروں راستی

نہ جوید جز از داد در راستی (۵) نیارد بداد اندروں کاستی

اس سے ہم کو یہ اور بھی معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی ایک مقبولہ خیال کن الفاظ میں ادا کرے گا۔ جب اس نے خوبی اور راستی کے خیال کو جز حرف استثنا کے ساتھ ادا کیا تو پانچ مقام پر اس کے واسطے فعل جستن لایا نہ "کردن"، جس کا استعمال ہجو کے مصرع میں ہوا ہے اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اگر فردوسی اس شعر کا مالک ہوتا تو قطعی اسے یوں لکھتا۔ "نجستند جز خوبی و راستی"۔ "کردن" اور "جستن" کے فرق سے جو تغیر اس مصرع میں واقع ہو گیا ہے ایک سخن فہم سمجھ سکتا ہے اور ان ہی باتوں سے ہم ایک اُستاد اور اس کے مقلّد کے کلام میں فرق دریافت کر سکتے ہیں ؎

نہ جستند از دہر جز نام نیک وزان نام جستن سرانجام نیک

اس شعر کے قریب قریب شاہ نامہ میں اشعار ملتے ہیں لیکن مجھ کو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ شعر نہیں ملتا۔ ؎

ہمہ داد کردند بر زیر دست نبودند جز پاک یزداں پرست

پرست، کسی اسم کے ساتھ مل کر اسم فاعل کے معنی دیتا ہے۔ مثلاً یزداں پرست
بت پرست، آتش پرست وغیرہ پاک کا اسم موصوف کیا ہے آیا یزداں یا
یزداں پرست۔ اب جز کے استعمال پر غور ہو اگر اس کے بجائے "مگر"
استعمال کیا جاتا تو مصرع کے معنی بالکل صاف ہو جاتے یعنی نبود ند
مگر خالص یزداں پرست۔ جز اور مگر میں جو فرق ہے وہ اظہر من الشمس ہے
شاہ نامہ میں یہی مطلب ان الفاظ میں ادا ہؤا ہے۔

که بے دشمن آرم جہاں را بدست | بنا شم مگر پاک یزداں پرست

دوسرے مقام پر کہا گیا ہے۔

گنهگار باشد تنِ زیر دست | مگر مردمِ پاک یزداں پرست

هر آں شه که در بند دینار بود | به نزدیک اہلِ خرد خوار بود

در بند چیزے بودن اِس قسم کا محاورہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے فردوسی
نے شاہ نامہ میں نہیں لکھا نیز اہلِ خرد کی ترکیب ہماری طبیعت پر کھٹکتی ہے
کیونکہ فردوسی ایسی ترکیبیں مشکل سے لاتا ہے ؎

بنا شد جز از بے پدر دشمنش | که یزدان بآتش بسوزد تنش

یہ شعر دیباچۂ شاہ نامہ میں ملتا ہے۔ ؎

چه گفت آں خداوند تنزیلِ وحی | خداوند امر و خداوند نہی
که من شہرِ علمم علیم در است | درست ایں سخن قولِ پیغمبر است
گواہی دہم کیں سخن رازِ اوست | تو گوئی دو گوشم بر آوازِ اوست
چو باشد ترا عقل و تدبیر و رائے | بنزد نبی و علی گیر جائے
گرت زیں بد آید گناہِ من ست | چنین ست و ایں رسم و راہِ من ست

یہ پانچوں شعر دیباچۂ شاہ نامہ میں موجود ہیں اور اسی وجہ سے غالباً صاحب ہجو "با" نے انھیں اپنے یہاں سے ترک کردیا ہے

ابا دیگراں مر مرا کار نیست   بدیں در مرا جائے گفتار نیست

یہ شعر مقدمۂ یوسف زلیخائے فردوسی میں اور قلمی شاہ ناموں میں بھی پایا گیا ہے۔ ہے

چو بر تخت شاہی نشاند خدائے   نبی و علی را بدیگر سرائے

اس شعر کی طرز پرانی نہیں معلوم ہوتی اور نہ شاہ نامہ میں ملتا ہے ہے

من ایں نامۂ شہریارانِ پیش   بگفتم بدیں نغز گفتارِ خویش

یہ شعر خاتمۂ جلد دوم شاہ نامہ میں یوں آیا ہے ہے

کہ ایں نامۂ شہریارانِ پیش   بہ پیوندم از خوب گفتارِ خویش

ہے اگر شاہ را شاہ بودے پدر   بسر بر نہادے مرا تاجِ زر

یہ وہی مشہور شعر ہے جو کہا جاتا ہے کہ طوس میں فردوسی کی واپسی کے وقت ایک لڑکے نے پڑھا تھا۔ نظامی عروضی اس شعر سے واقف نہیں۔ شعر کا بیانِ حقیقت کے خلاف ہے۔ محمود کا باپ سبکتگین ابتدا میں الپتگین کا غلام تھا مگر محمود کی ولادت کے وقت وہ زبردست امیر تھا اور عنقریب بعد غزنی کا بادشاہ ہوگیا۔ ہجو میں کم از کم کچھ تو واقعیت ہونی چاہیے بہرحال اس شعر کی سراغ رسی مجھ سے نہیں ہوسکی۔ ہے

ازاں گفتم ایں بیت ہائے بلند   کہ تا شاہ گیرد ازیں کار پند

کزیں پس بداند چہ باشد سخن   بااندیشہ از پندِ پیرِ کہن

دگر شاعراں را نیازارد او   ہماں حرمتِ خود نگہ دارد او

کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا　　بماند ہجا تا قیامت بجا
بنالم بدرگاہِ یزدانِ پاک　　فشانندہ بر سر پراگندہ خاک
کہ یارب روانش بآتش بسوز　　دلِ بندۂ مستحق برفروز

اِن اشعار میں حسب ذیل عربی الفاظ ہیں۔ بیت، شاعر، حرمت، ہجا، قیامت، مستحق اس کثرت سے عربی الفاظ کا استعمال فردوسی کی عادت مستمرہ کے خلاف ہے۔ اشعار میں وہ قدامت جو فردوسی کے ہاں پائی جاتی ہے بالکل نظر نہیں آتی۔ شاعر نے اپنے خیالات ایسی زبان میں ادا کیے ہیں جو آٹھویں اور نویں صدی کی زبان کہلائی جا سکتی ہے اور فی زمانا بھی ان خیالات کو قریب قریب ان ہی الفاظ میں ادا کیا جائے گا۔

بنالم بدرگاہِ یزدانِ پاک　　فشانندہ بر سر پراگندہ خاک

یہ شعر صاف نہیں۔ فشانندہ اور پراگندہ نے ایک قسم کی گنجلک پیدا کر دی ہے۔ خوش قسمتی سے شاہ نامہ میں اصلی شعر مل گیا۔ چنانچہ ؎

بنالم ز تو پیش یزدان پاک　　خروشان بسر بر پراگندہ خاک
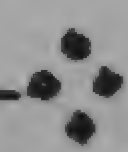
کہ سفلہ خداوندِ ہستی مباد　　جوانمرد را تنگ دستی مباد

قاضی نور اللہ شوستری کے ہاں نیز بمبئی اور نول کشوری نسخوں میں یہ شعر ملتا ہے۔ لیکن یقین ہے کہ سعدیؒ کی بوستان سے سرقہ کیا گیا ہے جہاں حکایت "کریم تنگ دست با سائل" میں ملتا ہے ؎

چو پروردگارش چنیں آفرید　　نیابی تو بر بندِ یزداں کلید

جلد چہارم شاہ نامہ میں یہ شعر یوں آتا ہے۔

چو پروردگارش چنیں آفرید　　تو بر بندِ یزداں نیابی کلید ؎

بزرگی سراسر بگفتار نیست — دو صد گفتہ چوں نیم کردار نیست

گرشاسپ نامہ نیز اُن شاہ ناموں میں جن میں داستانِ گرشاسپ ضم کردی گئی ہی یہ شعر "داستان آمدن رسولِ گرشاسپ نزدِ فغفور" میں ملتا ہی۔ چنانچہ:۔

ہنرہا سراسر بگفتار نیست — دو صد گفتہ چوں نیم کردار نیست

ہنر اور بزرگی کے الفاظ کی تبدیلی سے جو خوبی اس شعر میں پیدا ہوتی ہی محتاجِ بیان نہیں۔

بقیۂ ہجو

یہاں ہم اُن اشعار کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو تمام اساد کے نزدیک ہجو میں داخل ہیں اور جن پر مجموعی حیثیت سے تمام روایات متفق ہیں ؎

گرا یدونکہ شاہی بگیتی تراست — نگوئی کہ ایں خیرہ گفتن چراست

ندیدی تو ایں خاطرِ تیزِ من — نیندیشی از تیغِ خوں ریزِ من

کہ بد دین و بدکیش خوانی مرا — منم شیرِ نر میش خوانی مرا

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہی کہ فردوسی پر بد دینی کا اتہام لگایا گیا تھا اور یہ پہلا کھلا بیان ہی جو ہم اس سے سُنتے ہیں لیکن وہ ابیات جو اُس نے امیر نصر کے ہاں پیش کیے تھے ہمارے زیرِ نظر ہیں اور ہمیں تعجب معلوم ہوتا ہی کہ وہاں فردوسی نے یہ الزام کیوں نہ ظاہر کیا اور ہجو میں کیوں کیا۔ اس کا جواب ہمارے پاس یہی ہی کہ فردوسی کو اس کے متعلق اگر کوئی معلومات ہوتی تو امیر نصر کے سامنے اپنی بریت کی غرض سے ضرور بیان

کرتا اس لیے وہ تو اجنبی رہا لیکن ہجو کے معمار اس معاملے میں زیادہ خوش قسمت تھے انھیں نظامی عروضی یا اور کسی تذکرہ نگار سے یہ وجہ کشیدگی معلوم ہو گئی اس لیے اُنھوں نے شعر آخر میں اسے بددینی اور بدکیشی کے نام سے یاد کیا۔

مرا غمز کردند کان پُر سخن　　بمہرِ نبیؐ و علیؓ شد کہن

یاد رہے نظامی عروضی کے ہاں من جملہ ہجو کے چھ شعروں کے یہ پہلا شعر ہے۔ اب ناظرین کو غور کرنا چاہیے کہ یہ شعر یہاں کس قدر غیر موزوں واقع ہوا ہے وہ خود زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ مجھ کو بلا قصور ہجو کے بانیوں نے قید کر دیا ہے۔ تمہید سے اب تک جس قدر اشعار گزرے سب خطابیہ ہیں لیکن یہ شعر جمع غائب کے صیغہ میں ہے اور گزشتہ ربط کو بالکل توڑتا ہے۔ علیٰ ہذا آیندہ شعر سے بھی اس کا سلسلہ منقطع ہوتا ہے۔ یہ شعر اس بُری اینٹ کے مشابہ ہے کہ جہاں کہیں دیوار میں اس کے لیے جگہ کی جاتی ہے ناموزوں معلوم ہوتی ہے ہجو میں یہی کیفیت اس شعر کی ہے جہاں کہیں اسے ڈالا جاتا ہے کسی جگہ میل نہیں کھاتا۔ اس کو مصنفین ہجو قطعی ترک کر دیتے لیکن ایسا کرنے میں ان کا راز طشت از بام ہوتا تھا اس لیے کہ پُرانی روایات میں اصلاح دینا ان کے لیے ناممکن تھا۔ ہجو میں اس کا لایا جانا ایک تاریخی مجبوری ہے ؎

ہر آں کس کہ در دلش کینِ علی ست　　ازو خوار تر در جہاں گو کہ کیست

ظاہر ہے کہ یہ شعر گزشتہ شعر سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ پہلے بیت میں رسول اللہؐ اور حضرت علی کی محبت کا فردوسی پر الزام لگایا جاتا ہے یہ پچھلا جو غالباً شیعی رنگ آمیزی کا نتیجہ ہے صرف حضرت علی کے نام پر

قناعت کرتا ہے۔

منم بندۂ ہر دو تا رست خیز — اگر شہ کند پیکرم ریز ریز

من از مہر ایں ہر دو شہ نگزرم — اگر تیغِ شہ بگزرد بر سرم

یہ دونوں شعر متحد المعنی ہیں اور ایک دوسرے سے ماخوذ ہیں اور یقیناً "مرا غمز کردند" والے شعر کی خاطر ایجاد ہوئے ہیں۔ ان شعروں میں محمود پر جو الزام لگایا گیا ہے مذہبی رنگ کا ہے اور صحیح نہیں۔ ۵

منم بندۂ اہلِ بیت نبی — ستایندۂ خاکِ پائے وصی

شاہ نامہ میں یہ شعر یوں آتا ہے ۵

منم بندۂ اہلِ بیتِ نبی — سرافگندہ بر خاکِ پائے وصی

(داستانِ سیاوش)

---

۵ مرا سہم دادی کہ در پائے پیل — تنت را بسایم چو دریائے نیل

(اگر در کفِ پائے پیلم کنی — تنِ ناتواں ہم چو نیلم کنی)

شعر ثانی اکثر قلمی نسخوں میں ملتا ہے اور تقریرِ سخن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہونا چاہیے لیکن کلکتہ والے شاہ نامہ میں معلوم نہیں میکن نے کیوں خارج کر دیا۔ پہلے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصل میں "منم شیرِ نریش خوانی مرا" کے بعد لایا گیا ہوگا یہ بھی یاد رہے کہ پھر وہی خطابیہ سلسلہ جاری ہو گیا ہے۔ دیباچہ بایسنغری میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ سلطان نے فردوسی کو ہاتھیوں کے پاؤں میں کچلوانے کی دھمکی دی تھی۔ ہمیں تعجب معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمود جس کے دربار میں تمام مذہب و ملّت کے لوگ تھے فردوسی کو محض حبِّ رسول و آلِ رسول کی پاداش میں ایسی سزائے مہیب کی دھمکی دیتا۔ سلطان ہم نے مانا انتہائی متعصّب تھا کیا وہ حبِّ رسول یا

دوست داریِ آلِ رسول سے انکار کرسکتا تھا۔ مخترعینِ ہجو یہاں اس قسم کی کوشش کر رہے ہیں کہ سلطان کے فرضی وزیر حسن میمندی کے ساتھ ساتھ سلطان کو بھی خارجی ثابت کریں۔ یہ خیال کرنا کہ یہ اشعار فردوسی کے قلم سے نکلے ہیں خیال باطل ہے۔ فردوسی کی زبان میں یہ انداز اور لوچ کہاں سے آیا۔ اسی ہاتھی کے پاؤں میں روندنے کے خیال کو وہ اس سادگی سے ادا کرتا ہے ؎

دگر، ہیچ کژّے گمانی برم　　　بزیر پئے پیل تاں بسپرم

فردوسی اپنی سادگی اور برجستگی کو جو اس کی خصوصیات شاعری سے ہے کہیں فروگزاشت نہیں کرتا جس قدر کہ وہ غیر ضروری تکلّفات سے محترز ہے ؎

نہ ترسم کہ دارم ز روشندلی　　　بدل مہر آلِ نبی و علی
اگر شاہ محمود ازیں بگزرد　　　مرا ورا بیکجو نہ سنجد خرد

ان کا تعلق بھی اشعارِ بالا سے ہے ؎

چو بر تخت شاہی نشاند خدائے　　　نبی و علی را بدیگر سرائے
گر از مہرِ شاں من حکایت کنم　　　چو محمود را صد حمایت کنم

دونوں شعر غیر مربوط ہیں آخری شعر نظامی عروضی کے چھ شعروں میں سے ہے جس کا ربط "مرا غمز کردند کاں پُر سخن" الخ سے درست بیٹھتا ہے۔ آخری شعر میں حمایت اور حکایت عربی الفاظ ہیں شاہ نامہ میں مشکل سے ان الفاظ کا سُراغ چلے گا۔ ؎

بایں زادہ ام ہم بریں بگزرم　　　چناں داں کہ خاکِ پئے حیدرم

یہ شعر شاہ نامہ کے دیباچہ میں ملتا ہے اگرچہ مطبوعہ نسخوں میں اس کا

سُراغ نہیں چلتا۔ (مولانا نظامی کا یہ بیت بھی یاد رہے ؎

بخوے خوش آمودہ شد گوہرم   بریں زیستم ہم بریں بگزرم)

جہاں تا بود شہر یاران بود   پیام بر شہر یاران بود

کہ فردوسیِ طوسی پاک جفت   نہ ایں نامہ بر نامِ محمود گفت

بنامِ نبی و علی گفتہ ام   گہر ہائے معنی بسے سفتہ ام

پہلے شعر کے قافیے میں کسی قسم کی غلطی رہ گئی ہے۔ شعر سوم کا آخری مصرعہ بالکل برائے بیت ہے۔ ایسے مصرعوں کے لیے قادر نامہ اور خالق باری کے صفحات زیادہ موزوں تھے نہ ہجو کے اشعار۔ مصرعہ فی نفسہ نہایت بلیغ ہے لیکن اس کی بندش صاف کہ رہی ہے کہ میں فردوسی کے قلم سے نہیں نکلی۔ اسدی اور نظامی کی زبان پر البتہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ان اشعار میں دعوٰی کیا جاتا ہے کہ میں نے یہ کتاب سلطان محمود کے نام پر نہیں لکھی بلکہ نبی اور علی کے نام پر۔ شاہ نامہ اس دعوے کا سب سے اچھا قول فیصل ہے فردوسی اگر ایسا کرنا چاہتا تو چند مقام پر سلطان کی مدح کے ابیات جو شاہ نامہ میں پائے جاتے ہیں نکال کر اُن کی جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کی شان میں اشعار لکھ دینا اور یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا بلکہ بر خلاف اس کے ہم کو شاہ نامہ سے معلوم ہے کہ فردوسی نے خود نعت اور منقبت کے اشعار نہایت کمی کے ساتھ لکھے ہیں اور اس قدر کمی کے ساتھ لکھے ہیں کہ ان کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہے اس لیے ذرا مشکل سے ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ شاعر ہجو کے میدان میں آکر اتنا جوشیلا شیعہ بن جائے کہ پورے بیس بیت ہجو کے

منقبت اور نعت میں بھر دے۔ یہ بحث کہ آیا فردوسی شیعہ تھا یا سُنّی یا کچھ اور، ہم کسی اور موقع کے لیے اُٹھا رکھتے ہیں یہاں صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ فردوسی اگر شیعہ تھا جو بہت مشتبہ امر ہی تاہم اتنا جوشیلا شیعہ ہرگز ہرگز نہیں تھا جس کا وہ ہجو میں دعویٰ کر رہا ہی۔ اگر وہ اپنے مذہب میں اتنا سخت تھا تو متعدد شیعہ سلاطین کو چھوڑ کر محمود کے دربار میں کیوں آتا مصرع کہ فردوسیِ طوسیِ پاک جفت الخ

پر غور کرو کیا فردوسی اس شعر کا قائل ہی؟ فردوسی میں اور عیب ممکن ہی کہ ہوں لیکن وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہی کہ خود ستائی کا عیب اس میں نہیں تھا۔ شاہ نامہ اس قدر ضخیم ہی۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ شاعر نے اس میں اپنا نام کس مقام پر لیا ہی مشکل سے دو مقام پر۔ وہ بھی دقیقی کے ذکر میں اور وہاں بھی پورا پورا شبہہ ہوتا ہی کہ آیا اصل میں گوینده تھا یا فردوسی کیونکہ سب سے قدیم نسخہ میں جو ۵۲۰ھ کا نوشتہ ہی "گوینده" پایا جاتا ہی۔ اور وہ اشعار یہ ہیں ؎

بفردوسی آواز دادے کہ مے مخور جز بآئین کاوس کے

دیگر

زفردوسی اکنوں سخن یادگیر سخن ہائے شایستۂ دل پذیر

آمدم بر سر مطلب۔ اس شعر کی تمام طرز یہی کہہ رہی ہی کہ اس کا قائل کوئی غیر فردوسی ہی ؎

چو فردوسی اندر زمانہ نبود بدان بد کہ بخشش یگانہ نبود

یہ شعر بھی علیٰ ہذا کسی غیر فردوسی کے قلم سے نکلا ہی۔ اصل یہ ہی کہ شعر فردوسی کا تھا ہجو تراشوں نے بقدر ضرورت اس میں اصلاح دے دی۔

فردوسی نے اس کو یوں لکھا تھا ؎

سپاہے کہ آں را کرانہ نبود　　بداں بد کہ بخشش یگانہ نبود

(ج اول، ص ۳۹ سطر ۱۳، بمبئی ۱۲۷۵ھ)

؎ نہ کردی دریں نامۂ من نگاہ　　بگفتار بدگوئے گشتی زراہ

ہر آں کس کہ شعرِ مرا کرد پست　　نگیرد ش گردون گردندہ دست

پہلا شعر شاہ نامہ میں یوں آتا ہے ؎

نہ کرد اندریں داستاں ہا نگاہ　　ز بدگوے و بختِ بد آمد گناہ

ہجو کے بانیوں نے بقدر ضرورت اصلاح دے کر اُس کو خطابیہ صورت میں بدل دیا۔ شعر دوم کا شاہ نامہ میں پتہ نہیں چلا ؎

چو عمرم بہ نزدیکِ ہشتاد شد　　اُمیدم بیکبارہ برباد شد

بسی سال اندر سرائے سپنج　　بسے رنج بُردم بامیدِ گنج

دونوں شعر خاتمۂ شاہ نامہ میں ملتے ہیں۔ (از شاہ نامہ قلمی ۷۵۲ھ)۔ ؎

ز ابیات غرّا دو رہ سی ہزار　　مر آں جملہ در شیوۂ کارزار

اِس شعر پر غور کرو وہ متاخّرین کی طرز میں ہے فردوسی یہی مطلب یوں ادا کرتا ہے ؎

بود بیت شش بار بیور ہزار

دوسرے مقام پر کہتا ہے ؎ بشش بیور ابیاتش آمد شمار

دیکھو مطلب وہی ہے مگر ادائے مطلب میں کس قدر فرق ہے ؎

ز شمشیر و تیر و کمان و کمند　　ز گوپال و از تیغ ہائے بلند

زبرگستوان وز خفتان و خود — زصحرا و دریا و از خشک رود
ز گرگ و ز شمشیر و پیل و پلنگ — ز عفریت و از اژدہا و نہنگ
ز نیرنگِ غول و ز جادوے دیو — کز ایشان بگردون رسیدہ غریو
ز مردانِ نامی بروز مصاف — ز گردانِ جنگی گہ رزم و لاف
ہمان نامدارانِ با جاہ و آب — چو تور و چو سلم و چو افراسیاب
چو شہ آفریدون و چوں کیقباد — چو ضحاک بدکیش بے دین و داد

یہ ابیات نیز آنے والے اشعار شاہ نامہ کے مضامین کی فہرست دے رہے ہیں وہ بالکل متاخرین کی زبان ہی پلنگ اور نہنگ کا ذکر شاہ نامہ میں نہیں آتا۔ اِن کا داخلہ اس فہرست میں ثابت کرتا ہی کہ یہ ابیات فردوسی کے قلم سے نہیں نکلے ہ

چو گرشاسپ و سام و نریمان گرد — جہان پہلوانان با دست برد

شاہ نامہ میں گرشاسپ و نریمان کا قصہ (اگرچہ شاہ نامہ اُن کے ناموں سے واقف ہی) جو رستم کے اجداد میں سے مشہور پہلوان ہیں کہیں نہیں آتا اُن کی شہرت گرشاسپ نامہ کے بیانات پر منحصر ہی چوں کہ گرشاسپ نامہ اسدی بھی غلطی سے شاہ نامہ میں ملا دیا گیا تھا اس لیے ہجو کے مصنّفین نے گرشاسپ نامہ کو شاہ نامہ کا جزو جان کر شعر بالا میں گرشاسپ اور نریمان کا بھی ذکر کر دیا۔ فردوسی اگر یہ ابیات لکھتا تو کبھی اس غلطی کا ارتکاب نہ کرتا۔ اس کا دوسرا مصرعہ داستان سوسن رامش گر میں ملتا ہی ہ

زجا در رسیدہ بہ ہومان سپرد — جہان پہلوانان با دست برد
(ملحقات صفحہ ۵۷۹ سنہ ۱۲۰۵ ھ)

ے چو ہوشنگ و طہمورثِ دیوبند — منوچہر و جمشید شاہِ بلند
چو کاؤس و کیخسروِ تاجور — چو رستم چو روئین تنِ نامور
چو گودرز و ہشتاد پور گزین — سواران میدان و شیران کین

شاہ نامہ میں یہ شعر یوں آتا ہے ے

چو گودرز و ہفتاد پور گزین — سواران میدان و شیران کین

دوسرے مقام پر یوں آتا ہے ے

چو گودرز و ہفتاد پور گزین — ہمہ نامداران با آفرین

گودرز بن کشواد کے اصل میں اٹھتّر فرزند تھے جنگ پشن ولاون میں ان میں سے ستّر مقتول ہوئے۔ ے

ہمان نامور شاہ لہراسپ را — زریر سپہدار و گشتاسپ را
چو جاماسپ کاندر شمار سپہر — فروزندہ تر بد ز تابندہ مہر

شعر دوم شاہ نامہ میں یوں آتا ہے ے

چو جاماسپ کاندر شمارِ سپہر — فروزندہ تر بد ز ناہید و مہر

(صفحہ ۴۳۳ جلد چہارم ۱۲۷۵ھ)

ے چو دارائے داراب و بہمن ہماں — سکندر کہ بد شاہِ شاہنشہاں

اگر یہ شعر فردوسی کے قلم سے نکلتا تو وہ سکندر کے لیے شاہِ شاہنشہاں کا لفظ استعمال نہ کرتا۔ سکندر اسلام میں اس میں شک نہیں بہت کچھ ہر دلعزیز ہے لیکن فردوسی اس معاملے میں ایرانی اور بالخصوص ساسانی خیال کا واقع ہوا ہے۔ محب ایران ہونے کی حیثیت سے سکندر کو جو ایران کے چراغ سلطنت کا گل کرنے والا تھا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اشعار ذیل ہمارے دعوے کے شاہد ہیں:۔

هیونے زکرمان بیامد دمان (۱) بنزدیک اسکندرِ بدگمان
بدآنگہ کہ اسکندر آمد ز روم (۲) بایران وویران شد آں مرز و بوم
گر او ناجوانمرد بود و درشت کہ سی وشش از شہریاران بکشت
لبِ خسرواں پر زنفرین اوست ہمہ روئے گیتی پر از کینِ اوست
کسے نیست زین نامدار انجمن (۳) زفرزانہ و مردم رائے زن
کہ نشنید کا سکندر بد تہان چہ کرد از فرومایگی در جہان
نخست اندر آیم زسلم سترگ (۴) باسکندر آئینہ ور پیر گرگ (صفحہ ۵۳۵ بمبئی ۱۲۷۵ھ)
مرا در اسکندر ہمی پارہ کرد (۵) زبیدانشی کار یکبارہ کرد
سکندر کہ او خونِ دارا بریخت (۶) چنان آتشِ کین بما بر بہ بیخت
کہ دارا برادر پدر خواندے ہمے فیلقوسش پسر خواندے
پدر پاک بد مادرش بدگہر چنان دان کز و پاک ناید پسر

---

۵ چو شاہ اردشیرو چو شاپور او چو بہرام و نوشیروانِ نکو
"او" پہلے مصرع میں حشو ملیح ہے۔ کیا فردوسی اسی شستہ زبان کے لیے مشہور ہے؟

۵ چو پرویز ہرمز چو پورش قباد چو خسرو کہ پرویز نامش نہاد
اس شعر کے مطالعہ کے وقت خیال کیا گیا کہ اس میں کوئی غلطی ہوگی لیکن مختلف نسخوں میں ہم اس کو اسی صورت میں دیکھتے ہیں، فردوسی اگر اس شعر کا مالک ہوتا تو کیوں کر یقین کیا جاتا ہے کہ خسرو پرویز کو جو ایک مشہور بادشاہ ہے دو شخص یا دو بادشاہ بیان کرتا۔ اس شعر کے مصنف کے نزدیک ایک پرویز ہرمز کا بیٹا ہے دوسرا خسرو ہے جس کا نام پرویز

ہر۔ کیا فردوسی یہ غلط شعر لکھ سکتا تھا؟ ؎

چنیں نامداران و گردنکشاں | کہ دادم یکایک از ایشاں نشاں
همه مرده از روزگارِ دراز | شد از گفتِ من نامِ شاں زنده باز
چو عیسیٰ من ایں مردگانرا تمام | سراسر همه زنده کردم بنام

ہجو کے مصنفین کو یہاں فردوسی کے ان اشعار سے توارد ہو گیا ہے ؎

همه پہلوانان و گردنکشاں | کہ دادم دریں قصہ زیشاں نشاں
همه مرده از روزگارِ دراز | شد از گفتِ من نامِ شاں زنده باز
منم عیسی آں مردگاں راکنوں | روانشاں بمینو شده رہنموں

از ابتدائے ہفتخواں اسفندیار۔ ؎

یکے بندگی کردم ای شہریار | کہ ماند ز تو در جہاں یادگار
بناہائے آباد گردد خراب | ز باران و از تابشِ آفتاب
پی افگندم از نظم کاخِ بلند | کہ از باد و باراں نیابد گزند
برین نامہ بر عمرہا بگذرد | بخواند ہر آں کس کہ دارد خرد

مولفین ہجو نے یہ ابیات شاہ نامہ سے لیے ہیں چنانچہ ؎

یکے بندگی کردم ای شہریار | کہ ماند ز تو در جہاں یادگار
بناہائے آباد گردد خراب | ز باران و از تابشِ آفتاب
پے افگندم از نظم کاخِ بلند | کہ از باد و باراں نیابد گزند
بریں نامہ بر عمرہا بگذرد | ہمی خواند آنکس کہ دارد خرد

؎ نہ زینگونہ دادی مرا تو نوید | نہ این بودم از شاہ گیتی اُمید
بد اندیش کش روز نیکی مباد | سخن ہائے نیکم ببد کرد یاد

بر بادشہ پیکرم زشت کرد | فروزندہ اخگر چو انگشت کرد

ان اشعار کا اگرچہ شاہ نامہ میں کہیں پتہ نہیں چلتا مگر زبان پر لحاظ کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ فردوسی مصنّف نہیں "بداندیش کش روز نیکی مباد" کے قریب قریب سعدی کہتے ہیں ۔

ع کہ بد مرد را روئے نیکی مباد۔

اگر منصفی بود از راستان | بہ اندیشہ کردی درین داستان
بگفتی کہ من در نہادِ سخن | بداد ستم از طبع دادِ سخن
جہان از سخن کردہ ام چون بہشت | ازیں پیش تخم سخن کس نکشت
سخن گستران بیکران بودہ اند | سخن ہاے اندازہ پیمودہ اند
ولیک ارچہ بودند ایشان بسے | ہمانا نگفت ست زینسان کسے

"سخن پیمودن" فردوسی نے کم سے کم شاہ نامہ میں نہیں لکھا نہ وہ "ولیک" لکھتا۔ اشعار بالا میں الفاظ سخن و سخن گستر شعر اور شاعر کے معنوں میں مستعمل ہوئے ہیں ذیل میں ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ فردوسی سخن کو شعر کے معنی میں نہیں لکھتا سخن فردوسی کے ہاں کلام گفتگو بات چیت افسانہ تاریخ اور واقعہ کے معنوں میں ملتا ہے۔ مثال

سخن گوئے دہقان چہ گوید نخست | کہ نامِ بزرگی بگیتی کہ جست
(دیگر) سخن گوئے دہقان چو بنہاد خوان | یکے داستان راند از ہفتخوان
(دیگر) سخن ہائے ہرمزد چون شد بہ بن | یکے نوبے افگند ہو بد سخن
(دیگر) یکے پیر بد پہلوانی سخن | بگفتار و کردار گشتہ کہن
(دیگر) پژوہندۂ روزگار نخست | گزشتہ سخن ہا ہمہ باز جست

بگفتند پیشش یکا یک مہاں (دیگر) سخن ہائے شاہاں وگشت جہاں
جہاں دیدۂ نام او بود ماخ (دیگر) سخن دان با برگ و با برز و شاخ
کنون داستانہائے دیرینہ گوے (دیگر) سخن ہائے بہرام چوبینہ گوے
الا اے سخن گوئے مردِ کہن (دیگر) بگرداز رہِ آزو بگسل سخن
نمردست و ہرگز نمیرد سخن بود تازہ ہر چند گردد کہن

ان اشعار میں سخن گوئے سخن دان اور سخن کو ممکن ہے کہ شاعر و شعر کے مفہوم میں لیا جائے اور بعض موقعوں پر وہ معنی درست بھی بیٹھ جائیں لیکن شاعر حقیقت میں انھیں راوی داستان گوئے مورخ واقعہ تذکرے اور کلام کے معنوں میں استعمال کر رہا ہے۔ اگر ہمارے یہ شاہدات درست مانے جائیں تو ظاہر ہے کہ ہجو کے یہ اشعار فردوسی کے قلم سے نہیں نکل سکتے ؎

؎ بسے رنج بردم دریں سال سی عجم زندہ کردم بدیں پارسی

یہ شعر اگرچہ مطبوعہ شاہ ناموں میں ہجو کے سوائے کہیں نہیں ملتا لیکن قلمی شاہ نامہ نوشتہ ۷۵۲ھ کے خاتمہ میں یوں آتا ہے ؎

بسے رنج بردم دریں سال سی عجم گرم کردم بدیں پارسی ؎

؎ جہاں دار اگر نیستی تنگدست مرا بر سرگاہ بودے نشست
بدانش نبد شاہ رادست گاہ وگرنہ مرا بر نشاندے بگاہ

پہلا شعر یقیناً دوسرے شعر سے ماخوذ ہے جو نظامی عروضی کے چھ شعروں میں سے ایک ہے شاہ نامہ میں ان کا سراغ نہیں ملا۔ ؎

؎ چو دیہیم دارش نبد در نژاد ز دیہیم داران نیاورد یاد

چو اندر تبارش بزرگی نبود | نیارست نامِ بزرگاں شنود

دونوں شعر ایک دوسرے سے ماخوذ ہیں دوسرا شعر نظامی کے چھ شعروں میں ملتا ہے اور پہلا شعر فردوسی کی زبان نہیں میری حجت صرف اسی قدر ہے کہ فردوسی کے ہاں اسم فاعل "دیہیم دار" کا رواج نہیں شاہ نامہ دیہیم سے واقف ہے اور ترکیبی صورت میں "دیہیم جوی" اس میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً

گرانمایہ سیندخت بنہاد روے | بدرگاہِ سالار دیہیم جوے

(یا) بصندوق در مرد دیہیم جوے | دو اسپ گرانمایہ بست اندروے صفحہ ۱۰۱

بفرمود سالار دیہیم جوے (دیگر) کہ ندہند آں روز چیزے بدوے صفحہ ۱۰۰۶

چنیں داد پاسخ کہ اورا بگوے (دیگر) نہ تو شہریاری نہ دیہیم جوے صفحہ ۱۰۸۸

دیہیم دار باوجود تلاش شاہ نامہ میں میری نظر سے نہیں گزرا اس لیے میں اسی ایک نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ شعر بالا فردوسی کا ہو نہیں سکتا ۵

۵ اگر شاہ را شاہ بودے پدر | بسر بر نہادے مرا تاجِ زر

وگر مادرِ شاہ بانو بُدے | مرا سیم و زر تا بزانو بُدے

دونوں شعر حقیقت سے دور ہیں محمود کا باپ خود بادشاہ تھا محمود کی ماں مورخین کہتے ہیں رئیسِ زابل کی دختر تھی اسی لیے اس کو محمود زابلی کہا جاتا ہے یہ شعر شاہ نامہ میں نہیں ملتے ۵

۵ کفِ شاہِ محمودِ عالی تبار | نہ اندر نہ آمد سہ اندر چہار

ایسے بعید زمانہ میں عقد انامل کا رواج نظم میں جب کہ طریق ابجدی کا استعمال بھی نامعلوم تھا قیاس میں نہیں آتا ۵

۵ چو سی سال بردم بشہنامہ رنج | کہ شاہم بہ بخشد بپاداش گنج

شہے کو نتر سند د رویش بود بشہنامہ اور انشاید ستود

فردوسی اپنی تصنیف کو شاہ نامہ کے نام سے کبھی یاد نہیں کرتا، وہ اسے دفتر پہلوی، نامۂ خسرواں، نامۂ پاستاں وغیرہ ناموں سے یاد کرتا ہے۔ یہ ایک اتفاقی امر تھا کہ اس کا نام شاہ نامہ ہو گیا کیوں کہ فردوسی کے زمانہ سے پیشتر کم سے کم دو کتابیں ایسی موجود تھیں جن کا نام شاہ نامہ تھا ایک ابوالموئد بلخی کی تالیف تھا جس کا ذکر ہم تاریخ طبری اور قابوس نامہ میں پڑھتے ہیں چونکہ فردوسی کی تصنیف بھی اسی مضمون پر تھی اس لیے اس کا نام بھی عوام میں شاہ نامہ ہو گیا۔ عنصری بھی شاہ نامہ کا ذکر کرتا ہے لیکن وہ فردوسی کا شاہ نامہ معلوم نہیں ہوتا۔

عنصری اگر ز دجلہ فریدون گزشت بے کشتی .:. بشاہ نامہ برایں بر حکایت ست سمر

فردوسی کی تالیف کا سب سے اوّل ذکر کرنے والا اسدی طوسی ہے جو کہتا ہے ؎

بشہنامہ فردوسیٔ نغز گوے چو از پیش گویندگان برد گوے

شعر مذکورۂ بالا خاتمۂ شاہ نامہ کے اس شعر کے بہت قریب ہے ؎

بسی سال و پنج از سرائے سپنج بسے رنج بردم بامید گنج

اس میں شک نہیں کہ شاہ نامہ کی نظم میں تیس پینتیس سال صرف ہوئے لیکن شاعر غزنین میں سلطان کے پاس ۳۸۴ھ میں آیا ہے۔ دوسرے مصرعہ سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ فردوسی برابر تیس سال سلطان سے انعام لینے کی امید میں کام کرتا رہا اس لیے ہجو کے مولفین پھر اسی مشہور غلطی سے کام لے رہے ہیں کہ شاہ نامہ سلطان محمود غزنوی کے حکم سے لکھا گیا تھا۔

۵ مرا زیں جہان بے نیازی دہد   میانِ یلان سرفرازی دہد
یہ شعر شاہ نامہ میں یوں ہے ۵
مرا ازجہاں بے نیازی دہد   میانِ یلان سرفرازی دہد
(خاتمۂ جنگ پیران وگودرز)
۵ بپاداش گنجِ مرا در کشاد   بمن جز بہائے فقاعے نداد
فقاعے بیرزیدم از گنج شاہ   ازاں من فقاعے خریدم براہ
ان شعروں سے یہی مطلب اخذ ہو سکتا ہے کہ جب مجھ کو صلہ بخشنے کے لیے سلطان نے اپنا خزانہ کھولا تو صرف پیالہ بھر شربت کی قیمت عنایت فرمائی (یعنی بہت ہی کم انعام دیا) چونکہ اس قلیل مقدار سے صرف ایک پیالہ شربت خریدا جا سکتا تھا اس لیے میں نے ایسا ہی کیا۔ ان اشعار کا مصنف اگر فردوسی ہے تو ظاہر ہے کہ کوئی ذی ہوش انسان باور نہیں کر سکتا کہ فردوسی ان ساٹھ ہزار درم کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اس نے فقاعی حمامی اور انعام لانے والوں میں تقسیم کیے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان شعروں کا مصداق یہی قصّہ ہے، یہ قصہ ان ابیات کی ایجاد کا باعث ہے یا یہ شعر اس قصّہ کی اختراع کے ذمہ دار ہیں ناظرین جو چاہیں سمجھیں مگر میں ان کو فردوسی کی ٹکسال کا نہیں مانوں گا ۵
۵ پشیزے بہ از شہر یارے چنین   کہ نہ کیش دارد نہ آئین ودین
شاہ نامہ میں یہ شعر یوں وارد ہوتا ہے ۵
پلنگے بہ از شہر یارے چنیں   کہ نہ کیش دارد نہ آئین ودین
(جلد چہارم صفحہ ۱۴۴۶ سنہ ۱۲۷۵ھ)

ے پرستارزادہ نیاید بکار　　　اگرچند دارد پدر شہریار

یہ شعر بھی نظامی عروضی کے چھ اشعار میں شامل ہے۔ اس میں پھر سلطان کی ماں کی طرف اشارہ ہے لیکن جیساکہ اوپر دکھا چکا ہوں سلطان کی ماں کو لونڈی باندی کہنا بالکل غلط ہے اور جھوٹ ہے جو لکھ کر فردوسی اپنے آپ کو کیوں ذلیل کرتا۔ یہ شعر بیشک فردوسی کا ہے لیکن اس نے مختلف مقصد سے لکھا تھا جس کا قصہ یہ ہے کہ مہران ستاد نوشیرواں کے لیے خاقانِ چین کی لڑکیوں میں سے ایک لڑکی پسند کرنے اور لانے کے لیے بھیجا جاتا ہے، رخصت کے وقت نوشیرواں اسے ہدایت کرتا ہے کہ تو خاقان کی شبستان کو غور سے دیکھنا، اس کے کئی بیٹیاں ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ تو ان کی خوبصورتی اور آرایش لباس سے فریب کھا جائے، اصلی بیوی سے خاقان کی جو اولاد ہوا سے پسند کرنا، پرستار کی اولاد کی مجھ کو کوئی ضرورت نہیں وہ بادشاہ کی اولاد ہو تو ہو۔ اس موقع پر نوشیراں کہتا ہے ے

پرستار زادہ نیاید بکار　　　اگرچند دارد پدر شہریار

فردوسی نے اس کا استعمال اگرچہ مختلف غرض سے کیا تھا لیکن ہجو کے معماروں نے اپنے مطلب کا پاکر ہجو میں داخل کر کے ثابت کرنا چاہا کہ سلطان محمود اصیل سے نہیں تھا بلکہ باندی کا لڑکا تھا۔

ے سرِ ناسزایاں برافراشتن　　　وزایشاں امید بہی داشتن

سررشتۂ خویش گم کردنست　　　بجیب اندروں مار پروردنست

جن اصحاب نے شاہ نامہ کو غور سے پڑھا ہے کیا یقین کر سکتے ہیں کہ یہ فردوسی کی زبان ہے۔ فردوسی کے عہد میں ایسے کنایات کا رواج نہیں تھا اور نہ وہ خود لکھتا ہے، زبان میں یہ صفائی اور گھلاوٹ نظامی کے ہاں

البتہ ملتی ہے۔ شاہ نامہ میں ان اشعار کا کہیں پتہ نہیں چلتا نہ ان کے قریب المعنی اشعار ملتے۔ بہمن نامہ جو سلطان محمود شاہ بن ملک شاہ سلجوقی ۵۱۱ھ و ۵۲۵ھ کے عہد کی تصنیف ہے اس کے چند اوراق سرکاری کتب خانہ ٹونک کی ایک جلد نمبر ۵۰۳ میں محفوظ ہیں یہ اوراق اس میں شک نہیں اب سے تین ساڑھے تین سو برس پہلے کے نوشتہ ہیں۔ ان میں یہ شعر فرامرز بن رستم بہمن بن اسفندیار کو خطاب کرکے پڑھتا ہے ؎

زناجنس چشمِ بہی داشتن — بدل تخم یارے ازو کاشتن
سررشتۂ خویش گم کردنست — بجیب اندروں مار پروردن ست

آخر شعر دونوں میں ایک ہے اور پہلے شعر میں اگرچہ بندش ایک ہی وضع کی ہے الفاظ میں اختلاف ضرور ہے۔ ہر ایک شعر کی اصلیت کا اس زمانے میں پتا چلانا بہت مشکل کام ہے مگر اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ دونوں شعر ایک دوسرے سے ماخوذ ہوئے ہیں، اس قدر اور اضافہ کیا جاتا ہے کہ بہمن نامہ مطبوعہ بمبئی میں یہ اشعار نہیں ملتے ؎

درختیکہ تلخست ویرا سرشت — گرش در نشانی بباغِ بہشت
وراز جوئے خلدش بہنگامِ آب — بہ بیخ انگبیں ریزی و شہدِ ناب
سرانجام گوہر بکار آورد — ہماں میوۂ تلخ بار آورد

یہ معروف و مشہور اشعار ہیں اور عام طور پر فردوسی سے منسوب ہیں، جامی نے جب ہاتفی کا شاعری میں امتحان لیا تو یہی مضمون دیا تھا جس کو ہاتفی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے ؎

اگر بیضۂ زاغ عنبر سرشت — نہی زیرِ طاؤسِ باغِ بہشت
بہنگامِ آں بیضہ پروردنش — زانجیرِ جنت دہی ارزنش

دہی آبش از چشمۂ سلسبیل | برآن بیضہ گردم دمد جبرئیل
شود عاقبت بچۂ زاغ زاغ | بردرنج بیہودہ طاؤسِ باغ

یہ ابیات خواہ فردوسی کے ہوں خواہ کسی اور کے لیکن قدردانی بھی دولت کی طرح اندھی ہے جس نے اس کی معائب کی مطلق پروا نہیں کی۔ "انگبین" اور "شہدِ ناب" میں کیا فرق رہا، یہ میرا اعتراض نہیں ہے بلکہ صاحب خزانۂ عامرہ کا۔ ممکن ہے کہ اصل میں یہاں شیرِ ناب ہو، اور نہ اس بات کی پروا کی گئی کہ ان کا مضمون اُستاد ابوشکور بلخی ۳۳۶ھ کے اشعار سے ماخوذ ہے ؎

بدشمن برت مہربانی مباد | کہ دشمن درختیست تلخ از نہاد
درختیکہ تلخش بود گوہرا | اگر چرب و شیریں دہی مرورا
ہمان میوۂ تلخ آرد پدید | ازو چرب و شیریں نخواہی مزید

شاہ نامہ میں درخت کی تشبیہہ بہت عام ہے مثلاً ع بسانِ درختے بباغِ بہشت

(یا) درختے کہ پروردی آمد ببار | بہ بینی برش ہم کنوں در کنار
گرش بار خارست خود کشتۂ | وگر پرنیانست خود رشتۂ

(یا) درختے[۵۱] کہ شیریں بود بار او | نگردد کسے گردِ آزارِ او
وگر زانکہ شیریں نباشد برش | بخاک اندر آرند ناگہ سرش
بماند بباغ آن و در آتش این | تو خواہی چنان باش و خواہی چنیں

ہم کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ یہ اشعار فردوسی کے ہیں یا نہیں مگر سلیس اور سادہ گو فردوسی سے مشکل سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے

---

۵۱ یہ اشعار نواب بندہ علی خاں ۱۱۵۶ نے فردوسی کے کلام کے نمونے میں شاہ نامہ سے دیے ہیں لیکن مطبوعہ نسخوں میں میری نظر سے نہیں گزرے۔

اصلی رنگ کو چھوڑ کر ایک ایسی شاندار ترکیبیں استعمال کرتا جن سے محض بلاغت یا لفظی شان و شوکت مقصود ہو جو ہم "درفشانی" "باغ بہشت" "جوئے خلد" اور "شہد ناب" میں معائنہ کرتے ہیں ظاہر ہو کہ تمام مضمون تکلف کے ساتھ ادا کیا گیا ہو۔

جب کوئی شاعر ایک خاص خیال کسی موقع پر ادا کرتا ہو جب دوسرے مقام پر اس کا مرادف یا ہم معنی خیال ادا کرے گا تو اس میں بھی غالباً وہی تناسب مساوات اور طرزِ ادا ملحوظ رکھے گا جو پہلے خیال کی تسوید کے وقت اس نے مدِ نظر رکھی تھی کیوں کہ شاعر کا متخیلہ محدود ہو جس طرح کہ اس کے الفاظ کا ذخیرہ۔

اگر اس کو ہم ایک کلیہ مان لیں اور پھر اس میزان میں جس طرح کہ خط سے ملا کر خط شناخت کیا جاتا ہو ہم شاعر کے معلوم اشعار سے اس کے نامعلوم یا مشتبہ اشعار کا موازنہ اور مقابلہ کریں تو ہمارا خیال ہو کہ ہم صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی امید کر سکتے ہیں۔

شاہ نامہ ایک سمندر ہو اور فردوسی نے وہی ایک خیال مختلف موقعوں پر متغائر پہلوؤں سے باندھ دیا ہو تلاش نے اشعار بحث فیہ کے مقابل اشعار بھی شاہ نامہ میں دریافت کر لیے جو حسب ذیل ہیں۹

اگر بچۂ شیر ناخوردہ شیر — بپوشد کسے درمیانِ حریر
دہد نوش ادرا ز شیر و شکر — ہمیشہ ورا پرورانند بہ بر
بہ گوہر شود باز چوں شد بزرگ — نترسد ز آہنگِ پیلِ سترگ

یہ اشعار شاہ نامہ میں سیاوش کے بارے میں افراسیاب اور گرسیوز کے درمیان مکالمہ کے وقت آتے ہیں، سادہ طبیعت فردوسی اپنے شیر

کے بچّے کو حریر میں لپیٹ کر انسانی بغل میں دے دیتا ہے اور شیر و شکر
سے اس کے کھانے کا انتظام کر دیتا ہے لیکن وہ عالی دماغ شاعر اپنے
درخت کو سیدھا دنیا کے پردہ سے اٹھا کر نہ صرف بہشت "بلکہ باغِ
بہشت میں لے جاتا ہے، ہمارا خیال تھا کہ آبِ کوثر سے وہ پانی کا انتظام
کر دے گا جس کے متعلق ہمیں علم ہے کہ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید
اور شکر سے زیادہ شیریں ہے، نہیں وہ اس کو مبتذل اور پا افتادہ لفظ مان
کر اس کے بجائے "جوئے خلد" کا شاندار لفظ استعمال کرتا ہے جو آبِ کوثر
یا نہر کوثر سے زیادہ بلند اور باشکوہ ہے، پھر اس جوئے سے وہ انگبیں لاتا ہے
اور انگبین بھی کیسا دوسرے الفاظ میں دوہرا کر کہتا ہے "شہد ناب"۔ اب
ظاہر ہے کہ یہ تکلفات فردوسی کے مزاج میں داخل نہیں اور نہ یہ فلک
سیر تخیل فردوسی کا ہے، اسدی یا اس کا ہم مشرب اپنی زبان میں یہ لوچ
اور تخیل میں پرواز دکھا سکتا ہے۔ فردوسی نے یہی شیر کے بچّے کا مضمون
شاہ نامہ کے دوران میں بار بار دوہرایا ہے مضمون کا پیرایہ وہ بدل دیتا
ہے لیکن اپنی اصلی سطح نہیں چھوڑتا اور نہ تخیل بدلتا چنانچہ ؎

(۱) ہمان بچۂ شیر ناخوردہ شیر	ستانند ہمی مو بد تیز ویر
مرا ورا در آزد میان گروہ	چو دندان برآرد شود زو ستوہ
ابے آن کہ دیدہ است پستان مام	بخوئ پدر باز گردد تمام
(۲) کہ گر بچۂ شیر نر پروری	چو دنداں کند تیز کیفر بری
چو بازور و باچنگ برخیز داوے	بہ پروردگار اندر آویز داوے
(۳) چنیں گفت با من یکے ہوشمند	کہ جانش خرد بود و رایش بلند
کہ اے دایۂ بچۂ شیر نر	چہ رنجی کہ جاں ہم نیاری ببر

بکوشی و او را کنی پُر ہنر ۔ تو بے بر شوی چون وے آید ببر
نخستین کہ آیدش نیروے جنگ ۔ ہمان پرورانندہ آرد بچنگ

زدانا تو نشنیدی ایں داستان (۴) کہ برگوید از گفتۂ پاستان
کہ گر پروری بچۂ نرّہ شیر ۔ شود تیز دندان و گردد دلیر
چو سر بر کشد زود جوید شکار ۔ نخست اندر آید بپروردگار

ے بہ عنبر فروشاں اگر بگذری ۔ شود جامۂ تو ہمہ عنبری
دگر تو شوی نزد انگشت گر ۔ ازو جز سیاہی نیابی دگر
زبد گوہراں بد بنا شد عجب ۔ نشاید ستردن سیاہی زشب

میں اعتراف کرتا ہوں کہ شاہ نامہ میں یہ ابیات نہیں ملتے۔ نہ یہ انداز تکلف فردوسی کا مستمرہ انداز ہی۔ ے

ے زنا پاک زادہ مدارید اُمید ۔ کہ زنگی بشستن نگردد سفید

یہ شعر شہرت پیدا کر کے ضرب المثل بن گیا ہی ایسی صاف اور ہموار زبان مشکل سے فردوسی کی کہی جا سکتی ہی۔ فردوسی اس کے قریب قریب خیال ان الفاظ میں لکھتا ہی ے

ہر آں کس کہ دارد زگیتی امید ۔ چو جویندہ خرماست از شاخِ بید
(دیگر) بسا سانیاں تا مدارید اُمید ۔ مجوئید یاقوت از سُرخ بید صہ۱۲

دیگر

بنا بود نیہا مدارید اُمید ۔ نگوید کہ بار آورد شاخِ بید

بوستانِ سعدی میں ایک شعر یوں آتا ہے ؎

بکوشش نروید گل از شاخِ بید نہ زنگی بگرمابہ گردد سفید

(حکایت مرد درویش درخاک کیش)

سعدی کا پہلا مصرع فردوسی کے مصرع سے ماخوذ ہے فرق صرف اتنا ہے کہ ایک بار کہتا ہے دوسرا گل، لیکن سعدی کا دوسرا مصرع زنگی اور حمّام کے خیال کا نہایت بلند واقع ہوا ہے مگر ہجو کا مصرع اس سے بھی زبردست اور صاف ہے۔ مخفی نہ رہے کہ اگر سعدی کو ہجو کے اس مصرع کی اطلاع ہوتی تو ہرگز ہرگز اپنا مصرع نہ لکھتے کیونکہ جو لطافت کہ "زنگی بشستن نگردد سفید" میں ہے وہ سعدی کے مصرع "نہ زنگی بگرمابہ گردد سفید" میں نہیں۔ حالانکہ کل فرق دونوں مصرعوں میں "گرمابہ" اور "شستن" کے استعمال میں ہے اور نہ یہ بات سمجھ میں آتی کہ شیخ سعدی ایک بتذل سرقہ اپنے لیے کیوں گوارا کرتے۔ نیز فردوسی کی ہجو سے سعدی کا ناواقف رہنا بھی احتمال نہیں کیا جاسکتا اس لیے میں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوا ہوں کہ ہجو نگاروں نے سعدی کے مصرعہ میں "شستن" کے اضافہ سے لطافت پیدا کر کے مصرعہ پر اپنا قبضہ کر لیا۔ علاوہ ازیں بہمن نامہ میں یہ شعر یوں ملتا ہے ؎

زناپاک زادہ مدارید اُمید کہ ہندو بشستن نگردد سفید

؎ زبد اصل چشمِ بہی داشتن بود خاک در دیدہ انباشتن

بیت ہذا ان ابیات سے ماخوذ ہے ؎

سرِ ناسزایاں برافراشتن وزیشاں اُمیدِ بہی داشتن

سرِرشتۂ خویش گم کردن ست ۔۔۔ بجیب اندروں مار پروردن ست

دونوں کا مقصد ایک ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ وہی مضمون ایک مقام پر مختصر کردیا گیا ہے اور دوسرے مقام پر طوالت سے بیان کیا گیا ہے۔ بہمن نامہ کے شعر مذکورۂ بالا پر بھی لحاظ رہے۔

ـه جہاندار اگر پاک نامی بُدے ۔۔۔ دریں راہ دانش گرامی بُدے
شنیدی چو زین گونہ گونہ سخن ۔۔۔ زآئینِ شاہان و رسمِ کہن
دگر گونہ کردی بکارم نگاہ ۔۔۔ نگشتی چنیں روز گارم تباہ

ان اشعار میں جو مطلب ادا کیا گیا ہے وہ اس سے قبل ان الفاظ میں ادا ہوا تھا ـه

اگر منصفی بودے از راستاں ۔۔۔ بہ اندیشہ کردے دریں داستاں
بگفتے کہ من در نہادِ سخن ۔۔۔ بداد ستم از طبع داد سخن

ان کی بندش کی کمزوری کہہ رہی ہے کہ ان کا فردوسی سے کوئی تعلق نہیں۔

اس تنقید سے جو گزشتہ صفحات میں کی گئی ہے ناظرینِ کرام پر ہجو کی مصنوعی ہستی کا راز افشا ہو گیا ہوگا اس کی مصنوعیت اور مجعولیت کا پردہ کامل طور پر چاک کردیا گیا ہے۔ اس ٹکسال کے اکثر سکّے قلب ہیں اور وہ ابیات جن پر فردوسی کا داغ ہے شاہ نامہ سے سرقہ کیے گئے ہیں ایک خفیف جزو دیگر اساتذہ کے ہاں سے لیا گیا ہے۔ ہجو کا ایک حصّہ اس قسم کا بھی ہے جن کو شاہ نامہ نہ اپنے خیاباں کے پھول تسلیم کرتا ہے اور نہ تنقید کی روشنی ان پر سے تاریکی کے پردوں کو اٹھا سکتی ہے، ممکن ہے کہ مستقبل ان کی اصلیت پر روشنی ڈالے۔ فردوسی نے اگر نفس الامر میں کوئی ہجو لکھی تھی تو وہ فوراً برباد کردی گئی ہے اور

ضائع شدہ ہجو کا اب ایک شعر بھی ہمارے پاس نہیں البتہ اگر یہ فرض کرلیں کہ یہ وہی حصہ ہے جس کی سُراغ رسانی کسی ماخذ تک نہیں کی جاسکتی۔ اس قسم کے اشعار کی تعداد بہت کم ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرجان منڈویل کے ہیروں کی طرح ہجو کے ابیات میں بھی بالیدگی توالد اور تناسل کی قوت حلول کرآئی تھی کیونکہ نظامی کے عہد میں چھ بیت سے چودھویں صدی میں ایک سو پچاس اشعار سے زیادہ اس کی تعداد پہنچ گئی ہے اس قسم کی ترقی ہم تبرکات میں مشاہدہ کرتے ہیں اور فردوسی کی ہجو کیا تبرک سے کم تھی۔ حضرت عیسیٰ کی صلیب اگرچہ ابتدا میں ایک لکڑی کا ٹکڑا تھا لیکن قرون وسطےٰ میں وہی تبرک اگر یورپ کے کلیساؤں سے لے کر ایک جگہ انبار کردیا جاتا تو یقین ہے وہ انبار کئی گاڑیوں میں نہ سما سکتا۔ دنیا کی آبادی روز افزوں ترقی کرتی جارہی ہے اسی طرح فردوسی کی ہجو بھی روز افزوں ترقی کرتی گئی یہ کرشمہ اس میں شک نہیں نہایت حیرت انگیز ہے لیکن مظاہرِ افعالِ انسانی اس قسم کی بہت مثالیں پیش کررہے ہیں۔

ہجو کیا ہے شاہ نامہ خواں دنیا کا انتقام ہے سلطان محمود غزنوی کے خلاف کیونکہ وہ کسی شخصِ واحد کی تصنیف نہیں ہے بلکہ اس کے قصر کی تعمیر میں ساری قوم نے ہاتھ بٹایا ہے اور اس کی تکمیل میں کئی صدیاں گزری ہیں۔ گرشاسپ نامۂ اسدی، یوسف زلیخا، بہمن نامہ اور بوستانِ سعدی میں چار صدیوں کا فاصلہ ہے اور جو اشعار ان وسائل سے لیے گئے ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ سعدی کے زمانے تک ہجو کی تکمیل نہیں ہوچکی تھی۔

مضمون کے لحاظ سے اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہجو کے ضمن میں بہت شعر مرادف اور مکرر ہو گئے ہیں۔ ایسے ابیات کی طرف میں اپنی تنقید کے دوران میں اشارہ کر چکا ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجو کی دو ولادت گاہیں ہیں۔ شیعی نقطۂ خیال کے ابیات کی کثرت سے یہی مفہوم ہوتا ہے کہ اس عقیدے کے اصحاب نے ہجو کی سرپرستی میں غالب حصہ لیا ہے۔ ہجو کی تعمیر کے لیے سب سے زیادہ ذخیرہ شاہ نامہ سے لیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ ربط کلام کی غرض سے بعض اشعار میں اصلاح یا تبدیلی کی گئی ہو گی سلسلہ قایم کرنے کے لیے نئے اشعار کی بھی ضرورت محسوس ہوئی ہو گی، اس طرح سے یہ ہجو تیار ہوئی ہے جو آج بغیر کسی شبہہ کے فردوسی کی تصنیف مانی جاتی ہے۔ آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ دیباچہ نگار بایسنغر خانی نے ہجو کی تنظیم و تشکیل میں بڑا حصہ لیا ہے۔

ذیل میں وہ اشعار قلمی ہوتے ہیں جو اس غرض سے شاہ نامہ سے لیے گئے ہیں نیز جو غیر ذرائع سے اخذ ہوئے ہیں۔

اشعار ہجو	اشعار شاہ نامہ (طبع محمد مہدی اصفہانی، بمبئی، سنہ ۱۲۶۲ھ)
۱۔ چہ گفت آن خداوندِ تنزیل و وحی خداوندِ امر و خداوند نہی	۱۔ چہ گفت آن خداوندِ تنزیل و وحی خداوندِ امر و خداوند نہی
۲۔ کہ من شہر علمم علیم در است درست این سخن قولِ پیغمبر است	۶۔ کہ من شہر علمم علیم در است درست این سخن گفتِ پیغمبر است
۳۔ گواہی دہم کین سخن رازِ اوست تو گوئی دو گوشم بر آوازِ اوست	۷۔ گواہی دہم کین سخن رازِ اوست تو گوئی دو گوشم بر آوازِ اوست (از دیباچۂ شاہنامہ، در ستایش پیغمبر و یارانش، صد ۲)

اشعار ہجو	اشعار شاہ نامہ
۴۔ چو باشد ترا عقل و تدبیر و رائے	۱۔ اگر چشم داری بدیگر سرائے
بنزدِ نبی و علی گیر جائے	بنزدِ نبی و علی گیر جائے
۵۔ گرت زین بد آید گناہِ من ست	۲۔ گرت زین بد آید گناہِ من ست
چنین ست و این رسم و راہِ من ست	چنین ست آئین و راہِ من ست
۶۔ نباشد بجز بے پدر دشمنش	۴۔ نباشد جز از بے پدر دشمنش
کہ یزدان بآتش بسوزد تنش	کہ یزدان بآتش بسوزد تنش
	(دیباچۂ شاہنامہ در ستایش پیغمبر و یارانش ص۲)
منم بندۂ اہلِ بیتِ نبی	منم بندۂ اہلِ بیتِ نبی
ستایندۂ خاکِ پائے وصی	سر افگندہ بر خاکِ پائے وصی
	(شکایت فردوسی از پیری خود جلد اوّل ص۲۵۶، و یوسف زلیخائے فردوسی)
بشش بیت این نامہ و شش ہزار	۱۔ بود بیت شش بار بیور ہزار
بگفتم نکرد ایچ درمن نظار	سخن ہائے شایستۂ غم گسار
چنیں شہریاری و بخشندۂ	۳۔ چنیں شہریاری و بخشندۂ
بگیتی ز شاہاں درخشندۂ	بگیتی ز شاہاں درخشندۂ
نکرد اندریں داستانم نگاہ	۵۔ نکرد اندریں داستاں ہا نگاہ
بگفتار بد گوئے گم کردہ راہ	ز بد گوئے و بختِ بد آمد گناہ
حسد برد بد گوئی درکارِ من	۶۔ حسد برد بد گوئی درکارِ من
تبہ شد برِ شاہ بازارِ من	تبہ شد برِ شاہ بازارِ من
	(جلد چہارم ابتدائے داستان شیرین و خسرو، جلد چہارم ص۱۰۵۱)

اشعار ہجو	اشعار شاہ نامہ
بسی سال و پنج از سرائے سپنج	سی و پنج سال از سرائے سپنج
چنیں رنج بردم باُمید گنج	بسے رنج بُردم باُمید گنج
چو بر باد دادند رنجِ مرا	چو بر باد دادند رنجِ مرا
نبد حاصلے سی و پنجِ مرا	نبد حاصلے سی و پنجِ مرا
چو عمرم بہ نزدیک ہشتاد شد	کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد
امیدم بیکبار بر باد شد	اُمیدم بیکبارہ بر باد شد
	(تاریخ انجام شاہنامہ، صہ ۱۱۰۲)
نہ خسرو نژادے نہ والا سرے	نہ خسرو نژادے نہ والا سرے
پدر ز اصفہان بود آہنگرے	پدر ز اصفہان. بود آہنگرے
	(ج اوّل صہ ۱۶۱ سطر ۱۵ از آخر، طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)
چو جاماسپ کاندر شمارِ سپہر	چو جاماسپ کاندر شمارِ سپہر
فروزندہ تر بد ز تابندہ مہر	فروزندہ تر بد ز ناہید و مہر
	(جلد چہارم صہ ۱۰۷۳ ایضاً صہ ۵۲۳ نول کشور)
دراین نامۂ شہریاران بخواں	یکے نامۂ شہریاراں بخواں
سر از چرخِ گردوں ہمی بگزراں	نگر تا کہ باشد چو نوشیرواں
	(جلد چہارم عہد نامۂ نوشیروان بفرزند خود ہرمز۔ صہ ۹۲۰)
چنیں نامدارانِ و گردن کشان	ہمہ پہلوانان و گردن کشان
کہ دادم یکایک از ایشان نشان	کہ دادم درین قصہ زیشان نشان
ہمہ مردہ از روزگارِ دراز	ہمہ مُردہ از روزگارِ دراز
شد از گفتِ من نام شان زندہ باز	شد از گفتِ من نامِ شان زندہ باز

اشعار ہجو

چو عیسیٰ من این مردگان را تمام
سراسر ہمہ زندہ کردم بنام

مرا در جہان بے نیازی دہد
میانِ یلان سرفرازی دہد
یکے بندگی کردم ای شہریار
کہ ماند ز تو در جہان یادگار
بناہائے آباد گردد خراب
ز باران و از گردشِ آفتاب
پی افگندم از نظم کاخ بلند
کہ از باد و باران نیابد گزند
بریں نامہ بر عمرہا بگزرد
بخواند ہر آن کس کہ دارد خرد

چو این نامور نامہ آمد بہ بُن
پشیمان شد از گفتہائے کہن
ہر آن کس کہ دارد ہش و رای و دین
پس از مرگ بر من کند آفرین
نمیرم ازین پس کہ من زندہ ام
کہ تخمِ سخن را پراگندہ ام

اشعار شاہ نامہ

منم عیسیٰ آن مردگان را کنون
روانشان بمینو شدہ رہنمون
(جلد سوم ابتدائے ہفتخوان اسفندیار صـ ۵۹۹)

۱۔ مرا زین جہان بے نیازی دہد
میانِ یلان سرفرازی دہد
۵۔ یکے بندگی کردم ای شہریار
کہ ماند ز من در جہان یادگار
۶۔ بناہای آباد گردد خراب
ز باران و از تابشِ آفتاب
۷۔ پی افگندم از نظم کاخ بلند
کہ از باد و باران نیابد گزند
۸۔ بریں نامہ بر عمرہا بگزرد
ہمی خواند آن کس کہ دارد خرد
(جلد دوم، خاتمہ، جنگ پیران، در ستایشِ محمود و گلہ روزگار، صـ ۴۰۹)

چو این نامور نامہ آمد بہ بُن
زمن روی گیتی بشد پر سخن
ہر آن کس کہ دارد ہش و رای و دین
پس از مرگ بر من کند آفرین
نمیرم ازین پس کہ من زندہ ام
کہ تخمِ سخن را پراگندہ ام
(تاریخ انجام شاہنامہ، صـ ۱۱۰۲)

اشعار ہجو	اشعار شاہ نامہ
پرستار زادہ نیاید بکار	پرستار زادہ نیاید بکار
اگرچند باشد پدر شہریار	وگر زان کہ باشد پدر شہریار
	(جلد چہارم، پاسخ نامۂ خاقان از نوشیروان و فرستادن مہر استادران ص ۹۶۸)
پشیزے بہ از شہریارے چنین	پلنگے بہ از شہریارے چنین
کہ نہ کیش دارد نہ آئین و دین	کہ نہ کیش دارد نہ آئین و دین
	(جلد چہارم، ص ۴۴۶، ۱۲۷۵ھ بمبئی)
چو فردوسی اندر زمانہ نبود	کہ آن رامیان و کرانہ نبود
بدان بہ کہ بختش جوانہ نبود	ہمان بخت نوذر جوانہ نبود
	(جلد اوّل، آمدن افراسیاب بجنگ نوذر ص ۹۵)
چو گودرز و ہشتاد پورِ گزین	چو گودرز و ہفتاد پورِ گزین
سوارانِ میدان و شیرانِ کین	سوارانِ میدان و شیرانِ کین
	(جلد چہارم، ص ۱۰۷۲)
چو پروردگارش چنین آفرید	چو پروردگارش چنیں آفرید
نیابی تو بر بندِ یزداں کلید	نیابی تو بر بندِ یزداں کلید
	(جلد چہارم)
چو ایں نامور نامہ آمد بہ بُن	چو بشنید شاہ از پشوتن سخن
پشیمان شد از گفتہاے کہُن	پشیمان شد از کردہائے کہن
	(جلد سوم، رہائیٔ زال از دستِ بہمن ص ۶۶۲)
مرا در جہان شہریاری نواست	نہ او نہ جہان شہریاری نواست
بسے بندگانم چو کیخسرو است	بزرگست و با عہد کیخسرو است
	(جلد سوم، پاسخ گشتاسپ باسفندیار، ص ۶۱۸)

اشعارِ ہجو	اشعارِ شاہ نامہ
من این نامۂ شہریاران پیش	کہ این نامۂ شہر یارانِ پیش
بگفتم بدین نغز گفتارِ خویش	بہ پیوندم از خوب گفتارِ خویش
	(خاتمۂ جلد دوم، صفحہ ۵۶۲)
بدین زادم و ہم برین بگزرم	برین زادم و ہم بریں بگزرم
چنان دان کہ خاکِ پئے حیدرم	چنان دان کہ خاکِ پئے حیدرم
	(دیباچۂ شاہ نامہ قلمی، نعت و منقبت)
کہ پیش از تو شاہان فراوانِ بُدند	بر پیدشت بسیار شاہان بُدند
ہمہ نامدارانِ گیہان بُدند	ہمہ نامدارانِ گیہان بُدند

(گرفتاری خاقانِ چین و شکست تورانیان بدست رستم، جلد سوم صفحہ ۳۸)

بنالم بدرگاہِ یزدانِ پاک	بنالم ز تو پیشِ یزدانِ پاک
فشانندہ بر سر پراگندہ خاک	خروشان بسر بر پراگندہ خاک

(خاتمۂ داستان اسکندر، درگاہ آسمان و ستایش سلطان محمود، جلد سوم صفحہ ۲۰)

نمردہ است و ہرگز نمیرد سخن	نمردہ است و ہرگز نمیرد سخن
سخندان ز من این سخن فہم کن	بود تازہ ہر چند گردد کہن
فزون از تو بودند یکسر بجاہ	ز فرہاد و گیوت بر آرم بجاہ
بگنج و سپاہ و بہ بخت و کلاہ	بگنج و سپاہ و بہ تخت و کلاہ

(خواستن بیژن نبرد ہومان از گودرز، جلد دوم، صفحہ ۲۴۰)

اشعارِ ہجو	اشعارِ غیر شاہ نامہ
ز ناپاک زادہ مدارید امید	بکوشش نروید گل از شاخِ بید
کہ زنگی لشستن نہ گردد سفید	نہ زنگی بگرما بہ گردد سپید

(بوستانِ سعدی، حکایت مرد درویش در خاک کیش)

اشعارِ ہجو	اشعارِ غیر شاہ نامہ
کہ سفلہ خداوندِ ہستی مباد	کہ سفلہ خداوندِ ہستی مباد
جوانمرد را تنگ دستی مباد	جوانمرد را تنگ دستی مباد
	(بوستانِ سعدی، حکایت کریم تنگدست باسائل)
بزرگی سراسر بگفتار نیست	ہنرہا سراسر بگفتار نیست
دو صد گفتہ چون نیم کردار نیست	دو صد گفتہ چون نیم کردار نیست
	(گرشاسپ نامۂ اسدی، رسیدن رسول گرشاسپ نزد فغفور)
چو گرشاسپ و سام و نریمان گرد	زجادو ربودہ بہو مان بپرد
جہان پہلوانانِ بادست بُرد	جہان پہلوانانِ بادست بُرد
	(برزو نامہ داستانِ سوسن رامشں گر (ملحقات)
سرِ ناسزایان برافراشتن	زنا جنس چشمِ بہی داشتن
وز ایشان اُمیدِ بہی داشتن	بدل تخمِ یاری ازو کاشتن
سرِ رشتۂ خویش گم کردن ست	سرِ رشتۂ خویش گم کردن ست
بجیب اندرون مار پروردن ست	بجیب اندرون مار پروردن ست
زبد اصل چشمِ بہی داشتن	زنا جنس چشمِ بہی داشتن
بود خاک در دیدہ انباشتن	بدل تخمِ یاری ازو کاشتن
	(بہمن نامہ، قلمی)
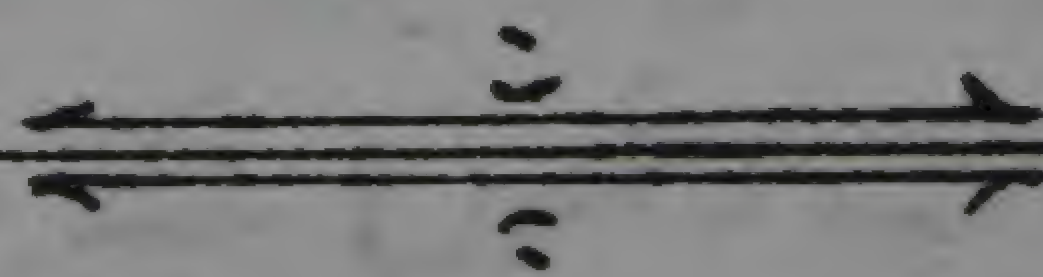
فردوسی کا مذہب

جس طرح فردوسی کے حالات کے متعلق ہماری معلومات ناکافی اور غیر یقینی ہیں۔ فردوسی کے مذہب کے متعلق بھی ہمارا علم ناقابل اعتبار ہے۔ ہم نے یہ مان لیا ہے کہ وہ شیعہ تھا اور اسی پر مطمئن ہیں لیکن تحقیقات کی روشنی میں ہمارا یہ اعتقاد وہم وخیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

پرانی روایات اس کو شیعہ بیان کرتی ہیں۔ شاہ نامہ اس بارے میں متضاد اور متناقض شہادت پیش کرتا ہے جس کی رُو سے فردوسی شیعہ بھی مانا جا سکتا ہے اور سُنّی بھی اور یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص شیعہ اور سُنّی دونوں ہو نہیں سکتا۔ البتہ ایک امر یقینی ہے کہ جہاں شاعر کو اس کے دشمنوں نے مجوسی۔ فلسفی۔ دہریہ۔ ملحد۔ کافر اور معتزلی کہا وہاں اس کو رافضی بھی کہا۔ اب دشمنوں کے بیانات پر کہاں تک اعتماد کیا جا سکتا ہے اگر وہ ملحد اور مجوسی تھا تو شیعہ بھی تھا۔ اگر یہ نہیں تھا تو وہ بھی نہیں تھا۔

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا ان ایام میں مذہبی نوعیت کے افترا اور بہتان لگانے کا میلان رکھتی تھی۔ حسنک میکال آخری وزیر سلطان محمود غزنوی پر بھی ملحد اور قرمطی ہونے کا الزام لگایا گیا تھا اور خلیفۂ بغداد نے سلطان محمود سے اس کا سر طلب کیا تھا۔ اصلی واقعہ صرف اس قدر تھا کہ جب حسنک حج بیت اللہ کے لیے گیا فاطمیین مصر نے اس کے اور سلطان کے لیے چند تحائف بھیجے جن کو اس نے قبول کر لیا۔ سلطان محمود نے جو اپنے وزیر کے مذہب سے خلیفہ کی بہ نسبت زیادہ صحیح واقفیت رکھتا تھا جواب میں کہلا بھیجا کہ حسنک میرے سامنے کا بچّہ ہے میں نے اس کو تربیت کیا ہے اگر وہ تمھارے نزدیک قرمطی ہے تو سمجھ لو کہ میں پہلے قرمطی ہوں۔ لیکن محمود کی آنکھ بند ہوتے ہی سلطان مسعود کے دور میں حسنک میکال کو اسی جرم میں سولی دی جاتی ہے۔

قدیم روایات جن کے متعلق ایما ہو چکا ہے حقیقت میں فردوسی کو شیعہ مانتی ہیں۔ ان میں سب سے پُرانی دیباچۂ قدیم کی روایت ہے جس کی رو سے سلطان محمود کے دربار میں فردوسی کی محرومی کا اولین محرک اس کا مذہب تھا لیکن صاحب دیباچہ یہ ذکر نہیں کرتا کہ وہ مذہب کیا تھا۔ اس کے الفاظ ہیں:۔

"اما بر سر شاہ نامہ شرط ادب نگاہ نداشتہ بود و سخن در مذہب خود گفتہ۔

گرت زین بد آید گناہ منست چنیں است این رسم و راہ منست

سلطان را نا خوش آمد و سیاست فرمود۔ پس عنصری و جملہ شاعران زین

بوس گردند و او را از سیاست خلاص دادند"۔ نظامی عروضی کی شہادت کی رو سے فردوسی صریحاً شیعی اور معتزلی ہے اس کا بیان ہے کہ خواجہ کے دشمنوں نے سلطان کو فردوسی کے انعام کے لیے مشورہ دیتے وقت کہا کہ صرف پچاس ہزار (درم) کافی ہوں گے اس لیے کہ وہ رافضی اور معتزلی ہے۔ دوسرے موقعہ پر نظامی فردوسی کی شیعیت کا اس وقت ذکر کرتا ہے جب فردوسی سلطان محمود کی ہجو لکھ کر اور فرار ہو کر طبرستان میں اسپہبد شہریار کے پاس جو آل باوند کا ایک رکن تھا پناہ گزیں ہوتا ہے۔ جب شاعر شہریار کے نام پر شاہ نامہ منسوب کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اسپہبد شہریار جواب میں اس وقت کہتا ہے۔ اے استاد محمود کو دشمنوں نے بہکا دیا اور تیری کتاب کا ذکر مناسب موقعہ پر نہیں کیا بلکہ تیری بدگوئی کی گئی۔ دوسرے تو شیعہ طبقہ سے تعلق رکھتا ہے اور جس کو خاندان پیمبر سے محبت ہوتی ہے۔ دنیاوی معاملات میں سرسبز نہیں ہوتا کیونکہ خود اہل بیت کو کامیابی نہیں ہوئی۔ نظامی کی اصل عبارت ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

(۱) "اما خواجۂ بزرگ (احمد بن حسن میمندی) منازعان داشت کہ پیوستہ خاک تخلیط در قدح جاہ او ہمی انداختند۔ محمود با آن جماعت تدبیر کرد کہ فردوسی را چہ دہم۔ گفتند پنجاہ ہزار درم و این خود بسیار باشد کہ او مردے رافضی است و معتزلی مذہب و این بیت بر اعتزال او دلیل کند کہ او گفت۔

بہ بینندگان آفرینندہ را نہ بینی مرنجان دو بینندہ را

و بر رفض او این بیت ہا دلیل است کہ او گفت۔

خردمند گیتی چو دریا نہاد | برانگیختہ موج ازو تند باد
میانہ یکے خوب کشتی عروس | برآراستہ ہم چو چشم خروس
اگر خلد خواہی بدیگر سرائے | بہ نزد نبی و وصی گیر جائے
چو ہفتاد کشتی درو ساختہ | ہمہ باد بانہا برافراختہ
پیمبر بدو اندرون با علی | ہمہ اہل بیت نبی و وصی
گرت زین بد آید گناہ منست | چنیں دان و این راہ راہ منست
برین زادم وہم برین بگزرم | یقین دان کہ خاک پئے حیدرم"

(چہار مقالہ طبع یورپ صـ ۴۹)

(۲) "و شاہ نامہ برگرفت و بطبرستان شد بہ نزدیک اسپہبد شہریار کہ از آل باوند در طبرستان بادشاہ او بود و آن خاندانے است بزرگ، نسبت ایشان بیزدگرد شہریار پیوندد و پس محمود را ہجا کرد در دیباچہ بیتے صد و بر شہریار خواند و گفت من این کتاب را از نام محمود با نام تو خواہم کردن۔ کہ این کتاب ہمہ اخبار و آثار جدان تست۔ شہریار اورا بنواخت و نیکوئی ہا فرمود و گفت یا استاد محمود را بر آن داشتند و کتاب را بشرطے عرضہ نہ کردند و ترا تخلیط کردند و دیگر تو مرد شیعیئی و ہر کہ تولی بہ خاندان پیغمبر کند اورا دنیاوی ہیچ کارے نرود کہ ایشان را خود نہ رفتہ است۔ محمود خداوندگار منست تو شاہنامہ بنام او رہا کن و ہجو او بہ من دہ تا بشویم و ترا اندک چیزے بدہم۔

(چہار مقالہ صفحہ ۴۹ و ۵۰)

لیکن نظامی کے بیانات پر زیادہ اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ خواجہ احمد بن حسن میمندی کی سرپرستی کی روایت کی جس کا نظامی

مدعی ہو شاہنامہ تائید نہیں کرتا۔ البتہ سلطان کے وزیر اوّل کا ذکر دو مقام پر شاہنامہ میں ملتا ہو اور فردوسی اس کا شکر گزار بھی معلوم ہوتا ہو۔

ز دستور فرزانۂ دادگر   پراگندہ رنج من آمد بسر

(شاہنامہ صفحہ ۲۴۴ طبع بمبئی سنہ ۱۲۷۵ ہجری)

نیز فردوسی کے شیعہ تذکرہ نگار خواجہ احمد بن حسن میمندی کو جسے غلطی سے وہ عام طور پر حسن میمندی لکھنے کے عادی ہیں۔ بالعموم فردوسی کا دشمن بیان کرتے ہیں۔ فردوسی کے ان دوستوں میں خواجہ کی نسبت اظہارِ دشمنی میں اس قدر مبالغہ کیا گیا ہو کہ غریب خواجہ کو خارجی مشہور کر دیا گیا۔ چنانچہ عبارت ذیل ملاحظہ ہو:۔

"وچنیں گویند ارکانِ دولت سلطان از شہر و نواحی با فردوسی انواع خلق و محبت و کرم ہمی نمودند و فردوسی در مدح ایشان سخن گفتے و حسن میمندی ازیں جہت با فردوسی مظنہ داشتے و غبارے درمیان ایشان شدہ بودے و ہیچ نوع چنانچہ فرمودۂ سلطان بود با او بجا نیاوردے تا بحدیکہ فردوسی گفت کہ حضرت حق عز شانہٗ در ازل چناں تقدیر فرمودہ بود کہ ایں کتاب بر زبان من تمام شود و مرا در مال سلطان طمعے نیست و بجاہ و تقرب حسن میمندی احتیاجے ندارم، می گفت مثنوی (کذا)۔

من بندہ کز مبادے فطرت نبودہ ام   مائل بہ مال ہرگز و طامع بجاہ نیز

سوے در وزیر چرا ملتفت شوم   چوں فارغم ز بارگہ بادشاہ نیز

د گویند حسن میمندی در طبع خوارج بود و فردوسی کہ تشیع بطبیعت داشت او را عدم الوجود میدانست و ہرچند احبّا و اودّا فردوسی را بر موافقت

و ترک مخالفت وزیر تحریص می کردند او اجتناب و اعتراض زیادہ نمودہ میگفت۔

بدل ہر کہ بغض علی کرد جائے | ز مادر بود عیب آن تیرہ رائے
کہ ناپاک زادہ بود خصم شاہ | اگر چند باشد بایوان دگاہ
ز میمندی آئین مردی مجوے | ز نام و نشانش مکن جستجوے
قلم بر بسر او بزن ہجو من | کہ گم باد نامش بہ ہر انجمن

(دیباچہ بایسنغر خانی)

یہ بیانات اگرچہ تاریخی لحاظ سے بے سروپا ہیں نہ فردوسی ایسا خود پسند اور مغرور تھا نہ خواجہ احمد بن حسن میمندی خارجی اور نہ یہ اشعار فردوسی کے۔ لیکن میں نے اس غرض سے ان کو یہاں نقل کیا ہی تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ شیعہ حلقوں میں خواجہ کس نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

فردوسی کی انتہائی پیری اور جسمانی کمزوریوں کا خیال کرتے ہوئے اسی سال کی عمر میں طبرستان جیسے دُور دراز ملک کا سفر اختیار کرنا اور جاتے ہی شہر یار کے ہاں رسائی پیدا کر لینا غیر اغلب معلوم ہوتا ہی۔ جس طرح کہ خود شہر یار کی شخصیت غیر یقینی ہی۔

اسپہبد شہر یار

تاریخ میں اس کی شخصیت نہایت عجیب ہی۔ نہ صرف اس کے نام بلکہ اس کی ہستی کو مشتبہ نظروں سے دیکھا جانا چاہیے اس کی زندگی کے کارناموں سے ہمیں اس قدر علم ہی کہ :۔

شہر یار، شروین بن رستم بن سرخاب بن قارن بن شہر یار کا فرزند ہی جو ماکان بن کاکی کا معاصر تھا اور شہر یار خود رکن الدولہ بویہ اور

وشمگیر بن زیار کا ہم عصر تھا۔ اس کا فرزند جو دادا کے نام پر شروین کے نام سے موسوم تھا اس کی حیات ہیں وفات پا جاتا ہی اور شہریار قابوس بن وشمگیر اور سلطان محمود کے زمانے تک زندہ رہتا ہی اور فردوسی اسی کے دربار میں شاہ نامہ لے کر جاتا ہی۔

یہ بیان میں نے ابن اسفندیار کی تاریخ طبرستان کے انگریزی ترجمہ سے لیا ہی جس کو پروفیسر براؤن نے شائع کیا ہی۔ مرزا محمد قزوینی شہریار کے زمانے کے متعلق صاحب مرزبان نامہ کے ذکر میں کہتے ہیں :۔

"پدر مرزبان اسپہبد رستم بن شہریار بن شروین معاصر شمس المعالی قابوس بن وشمگیر (۳۶۶—۴۰۳ھ) بود در فریم (پریم) وشہریار کوہ قائم مقام پدر شد و پدرش شہریار بن شروین معاصر سلطان محمود غزنوی بود و در ۳۲۷ ہجری (بقول شیفر۔ معلوم نیست از روے چہ ماخذے) بتخت نشست و مدتے دراز بماند و زمان سلطان محمود را درک نمود و اوست کہ فردوسی بعد از فرار از دربار سلطان محمود بنزد وے رفت و خواست کہ شاہ نامہ بنام او کند و آں حکایت معروفست"

(مرزبان نامہ مقدمۂ مصحح صفحہ دادیہ)

اس کی تاریخِ وفات کے لیے مرزا موصوف لکھتے ہیں :۔

"تاریخ وفات ایں شہریار معلوم نیست ہمیں قدر ابن اسفندیار گوید "شہریار مدتے دراز بماند۔ تا در عہد شمس المعالی قابوس بن وشمگیر وہم در عہد سلطان یمین الدولہ محمود بماند" وچون تاریخ اتمام شاہ نامہ در ۴۰۰ ہجری است در ہر حال وفات شہریار بعد ازاں واقع شدہ است"

(چہار مقالہ صفحہ ۱۹۰)۔ گویا ۳۲۷ ہجری میں شہریار تخت نشین ہو کر

۴۰۰ ہجری کے بعد تک زندہ رہا۔ یہ طویل مدّت سلطنت بجائے خود ایک حیرت خیز امر ہے اور تریسٹھ سال سلطنت کرنے کے باوجود اس دراز مدّت میں وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتا جس کا تاریخیں ذکر کرتیں۔ اس کے معاصر وشمگیر اور رکن الدولہ جبکہ ۳۵۰ ہجری اور ۳۶۶ھ میں وفات پاتے ہیں شہریار فردوسی کے انتظار میں پانچویں صدی کے آغاز تک مرنے کا نام نہیں لیتا۔ مرزا محمد کا بیان اور بھی عجیب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رستم شہریار کا فرزند شمس المعالی قابوس کا ہم عصر ہے اور خود شہریار سلطان محمود ۳۸۸ ہجری و ۴۲۱ ہجری کا ہم عہد ہے۔ اس طرح بیٹا باپ سے پہلے تخت نشین ہو جاتا ہے اس سے عجیب وہ بیان ہے جو ابن اسفندیار دے رہا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"شہریار کا جانشین اسپہبد دارا ہوا جس نے صرف تھوڑی مدت حکومت کی۔ دارا کے بعد اس کا فرزند اسپہبد شہریار[۱] برسر تخت آیا جو قابوس بن وشمگیر کے ساتھ اس کی اٹھارہ سالہ مہاجرت میں شریک رہا۔ جرجان میں قابوس کے ساتھ واپس آیا اور یہاں آکر اس نے کارہائے نمایاں کیے۔ شہریار کوہ فتح کیا اور باقی بن سعید کی اعانت سے ۳۸۷ھ میں اس نے فیروزان بن حسن کو شکست دی اور قابوس کے لیے ملک کو پاک وصاف کر کے جب خود طاقتور ہو گیا تو قابوس سے بغاوت کی اور رستم بن مرزبان کے ہاتھ پر گرفتار ہو کر باقی عمر قید میں گزاری"۔

---

[۱] یہ یاد رہے کہ اسی شہریار کو تاریخ یمینی میں "اسپہبد شہریار بن شروین" کہا گیا ہے۔ دیکھو صفحہ ۱۷۳ تاریخ یمینی۔ مطبع محمدی۔ لاہور۔

اب ایک نئی دشواری پیش آتی ہے۔ یعنی ایک شہریار کے بجائے ایک ہی وقت میں دو شہریار ماننے پڑتے ہیں۔ یعنی شہریار ثانی اور شہریار ثالث (آل باوند میں تین شہریار گزرے ہیں) شہریار ثالث اگرچہ دارا کا فرزند اور جانشین ہے اور شہریار ثانی اگرچہ دارا کا مورث ہے دونوں ہم عصر بن جاتے ہیں کیونکہ بقول ابن اسفندیار دونوں قابوس اور سلطان محمود کے معاصر ہیں۔ شہریار ثالث قابوس کے لیے اس کا آبائی ملک فتح کرتا ہے لیکن شہریار ثانی کسی اور ضرورت سے نہیں صرف فردوسی کی خاطر سنہ ۴۰۰ ہجری کے بعد تک زندہ مانا جاتا ہے۔

ان مشکلات کو مد نظر رکھ کر میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ شہریار ثانی کی وفات کو قابوس کی جلاوطنی کے زمانے سے قبل جو سنہ ۳۷۰ھ سے شروع ہو کر سنہ ۳۸۸ ہجری پر ختم ہوتا ہے مان لیا جائے اور اس کے دربار میں فردوسی کے جانے کے قصے کو بے بنیاد تصوّر کیا جائے۔

ایک فرانسیسی کتاب میں (مملوکۂ پروفیسر محمد شفیع ایم۔اے وائس پرنسپل اورینٹل کالج لاہور) جس کا نام اس وقت میری یاد سے اتر گیا ہے۔ شہریار ثانی۔ دارا اور شہریار ثالث کے سنین سلطنت حسب ذیل ملتے ہیں:۔

شہریار ثانی جلوس سنہ ۳۱۷ ہجری م سنہ ۹۲۹ عیسوی۔ وفات سنہ ۳۵۵ ہجری م سنہ ۹۶۶ عیسوی۔ دارا جلوس سنہ ۳۵۵ ہجری م سنہ ۹۶۶ عیسوی۔ وفات سنہ ۳۶۲ ہجری م سنہ ۹۷۲ عیسوی۔ شہریار ثالث جلوس سنہ ۳۶۲ ہجری م سنہ ۹۷۲ عیسوی۔ وفات

سنہ ۳۹۷ ہجری م سنہ ۱۰۰۶ عیسوی۔
ان سنین پر بظاہر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ اب ظاہر ہی کہ شہر یار ثانی کے پاس فردوسی کا سنہ ۴۰۰ ہجری میں جانا ناممکن ہی۔ رہا شہر یار ثالث۔ اول تو اس کے دربار میں فردوسی کا جانا تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اگر مان لیا جائے کیونکہ تاریخ عتبی میں اسی شہر یار کو اسپہبد شہر یار بن شروین کے نام سے یاد کیا گیا ہی اس لیے احتمال ہو سکتا ہی کہ فردوسی اس کے پاس گیا ہو۔ لیکن فردوسی کو اس کے پاس جانے کے لیے کوئی وقت نہیں ملتا۔ شہر یار ثالث سنہ ۳۹۷ ہجری میں وفات پاتا ہی لیکن وفات سے قبل ایک عرصہ قید میں گزارتا ہی اس لیے سنہ ۴۰۰ ہجری میں فردوسی اس کے ہاں بھی نہیں جا سکتا۔
ایک اور امر قابلِ توجہ ہی۔ مرزا محمد حاشیۂ چہار مقالہ صفحہ ۱۹ میں لکھتے ہیں کہ چہار مقالہ کے تمام نسخوں میں شہر یار کے بجائے شہرزاد اور طہران کے مطبوعہ چہار مقالہ میں شیرزاد اور ابن اسفندیار کی تاریخ طبرستان کے نسخوں میں شہر یار تھا چونکہ تاریخ میں کسی شہرزاد یا شیرزاد کا سراغ نہیں چلا اس لیے انھوں نے ابن اسفندیار کی سند پر شہر یار اختیار کر لیا۔ بہر حال یہ شہر یار یا شہرزاد یا شیرزاد خواہ ہم اس کو کسی نام سے پکاریں ایک ایسی عجیب ہستی ہی جس کے نام اور شخصیت پر پردہ پڑا ہوا ہی اور کوئی تعجب نہیں اگر اس کا وجود افسانوی ثابت ہو۔
بقول نظامی شہر یار محمود کو اپنا آقا تسلیم کرتا ہی اور کہتا ہی "محمود خداوندگار منست"۔ لیکن ہمیں معلوم ہی کہ ان ایام میں سلطان محمود کا

طبرستان سے کوئی تعلق نہیں تھا ان ممالک کا بادشاہ قابوس بن وشمگیر تھا اور شہریار اس کا محکوم تھا۔ ان حدود میں محمود کے سیاسی اثرات قابوس کی وفات کے ایک عرصہ بعد پھیلتے ہیں۔

حق یہ ہے کہ فردوسی نہ طبرستان گیا نہ اور کہیں بلکہ جب سلطان محمود سے مایوس ہوا امیر ابوالمظفر نصر بن ناصرالدین برادر سلطان محمود کے پاس غالباً خراسان یا سجستان چلا گیا۔ میرا یہ عقیدہ خود شاہ نامہ کے بیانات پر مبنی ہے۔ نصر ان ایام میں یا امیرالجیوش خراسان تھا یا والئ سجستان۔ اس کا ایک درہم ضرب سجستان سنہ ۴۰۱ ہجری لاہور میوزیم میں محفوظ ہے۔

داستان شیریں خسرو کی تمہید میں فردوسی شاہ نامہ کے ذکر کے بعد سلطان سے اپنے تعلقات کی برہمی کا تذکرہ یوں کرتا ہے:۔

بود بیت شش بار بیور ہزار سخن ہائے شایستۂ غم گسار
نہ بیند کسے نامۂ پارسی نوشتہ با بیات صد پارسی
اگر باز جویند ازو بیت بد ہما نا نباشد کم از پنج صد
چنین شہریارے و بخشندۂ بگیتی ز شاہان درخشندۂ
نکرد اندرین داستاں ہا نگاہ ز بدگوئے و بخت بد آمد گناہ
حسد برد بدگوے در کار من تبہ شد برِ شاہ بازار من

اور سالار شاہ یعنی امیر نصر کی خدمت میں شاہ نامہ پیش کر کے صلہ کا امیدوار ہوتا ہے، ساتھ ہی امیر نصر سے استدعا کرتا ہے کہ امیر موصوف سلطان سے اس کی سفارش کرے۔ چنانچہ شاہ نامہ ؎

چو سالار شہ ایں سخنہاے نغز بخواند ببیند بپاکیزہ مغز

زگنجش من ایدر بوم شادمان　　گزو دور بادا بد بدگمان
وزان پس کند یاد بر شہریار　　مگر تخم رنج من آید ببار
کہ جاوید بادا افسر و تخت او　　زخورشید تابندہ تر بخت او

اشعار بالا میں فردوسی سلطان کی ناقدردانی کا شاکی ہی جو دشمن کی سعایت اور بدگوئی کا نتیجہ ہی اس بدگوئی کی تشریح اور تاویل تذکرہ نگاروں نے فردوسی کے اعتزال اور شیعیت سے کی ہی لیکن ان اشعار پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ یہ تاویل بالکل نامناسب ہی اور میرا ذاتی عقیدہ ہی کہ اس بدگوئی کا فردوسی کے مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ عام اس سے کہ وہ شیعہ ہو یا معتزلی یا سنی مختصر یہ کہ مذہب سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔

حقیقت نفس الامر یہ ہی کہ قدما بھی فردوسی کے مذہب سے اسی قدر تاریکی میں ہیں جس قدر کہ ہم اور ہمارے اہلِ عصر۔ ذیل میں شاہ نامہ سے وہ اشعار نقل کیے جاتے ہیں جو ہمارے شاعر کی شیعیت کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ دیباچۂ شاہ نامہ میں خلفاے راشدین کا نام بنام ذکر کرنے کے بعد جیسا کہ اہل تسنن کا دستور ہی یہ اشعار آتے ہیں:۔

حکیم این جہان را چو دریا نہاد　　برانگیختہ موج ازو تند باد
چو ہفتاد کشتی برو ساختہ　　ہمان باد بانہا برافراختہ
یکے پہن کشتی بسان عروس　　بیاراستہ ہم چو چشم خروس
محمدؐ بدو اندرون با علیؓ　　ہمان اہل بیت نبیؐ و وصی
خردمند کز دور دریا بدید　　کرانہ نہ پیدا نہ بن ناپدید

بدانست کو موج خواہد زدن | کس از غرق بیروں نخواہد شدن
بدل گفت اگر با نبی و وصی | شوم غرقہ دارم دو یار وفی
ہمانا کہ باشد مرا دستگیر | خداوند تاج و لوا و سریر
خداوند جوئے وِمی و انگبین | ہمان چشمۂ شیر و مارِ معین
اگر چشم داری بدیگر سرائے | بنزد نبیؐ و علیؓ گیر جائے
گرت زین بد آید گناہ منست | چنین است این رسم وراہ منست
دلت گر براہ خطا مائل است | ترا دشمن اندر جہاں خود دلست
نباشد جز از بے پدر دشمنش | کہ یزدان بآتش بسوزد تنش

خلفائے راشدین کی منقبت کے بعد ہی دیباچے میں ان اشعار کا ایراد ان کی حیثیت کو مشتبہ کر رہا ہے۔ پچھلے تین اشعار جن میں غیر ضروری جوش دکھایا گیا ہے رہا سہا پردہ فاش کر دیتے ہیں۔ فردوسی سے سخت اشتعال کے موقعوں پر بھی ایسی سخت زبان کی مشکل سے امید کی جاتی ہے۔ وہ جس طرح نرم گفتاری اور شیریں زبانی کی تلقین کرتا ہے اُسی طرح اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ اس بارے میں اس کا مقولہ ہے :

درشتی ز کس نشنود نرم گوے | سخن تا توانی بآزرم گوے

جو لوگ شاہ نامہ کے ذریعے فردوسی کے اخلاق، خصائل اور سیرت سے واقف ہیں، ہرگز ہرگز یقین نہیں کر سکتے کہ فردوسی ان اشعار کا مصنف ہے۔ نیز شاہ نامہ کا دیباچہ تنگ چشمانہ مذہبی جوش دکھلانے کے لیے قطعی غیر موزوں مقام ہے۔ اظہارِ عقیدت کی غرض سے میں مانتا ہوں کہ فردوسی شیعہ ہونے کی بنا پر محبت و تفضیل حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لیے جو چاہتا لکھتا لیکن نہ ایسی زبان میں جس سے

دوسرے فریق کی دل آزاری کا احتمال ہو۔ سلطان محمود ایک سُنّی بادشاہ تھا اور شیعہ حلقوں میں کٹّر سنّی مانا جاتا ہے۔ بلکہ نظامی عروضی کہتا ہے "سلطان محمود مردے متعصب بود" (چہار مقالہ صفحہ ۴۹) ایسے بادشاہ کے دربار میں اوّل تو شیعہ سلاطین بویہ و دیالمہ کو چھوڑ کر فردوسی کا جانا کیا ضرور تھا اور اگر گیا تھا تو اپنے مذہب کا آشکار کرنا کیا فرض تھا اور اگر کیا تھا تو صورت حالات میں سب سے معقول اور سنجیدہ طریقہ یہی تھا کہ اپنے مذہب کا ایسے الفاظ میں ذکر کرتا جس سے کم سے کم درباری مذہب کو یا وہ مذہب جس کا سلطان پیرو تھا صدمہ نہ پہنچتا کیونکہ سلطان کے ہاں فردوسی (اور اس امر پر تمام اسناد اور خود فردوسی متفق ہیں) انعام اور صلہ کی امید میں گیا تھا نہ اس کے مذہب پر سبّ وشتم کرنے اور اپنے مذہب کی احمقانہ تلقین کرنے۔ میرا مقصد اسی قدر ہے کہ فردوسی کو معقول پسند انسان ہونے کی حیثیت سے سلطان کے مذہبی جذبات کو کسی طرح برافروختہ کرنا نہیں چاہیے تھا۔ اس قدر جاننے کے بعد جب ہم شاہ نامہ میں ایسے اشعار دیکھتے ہیں:۔

دلت گر براہ خطا مائلست ترا دشمن اندر جہاں خود دلست

نباشد جزاز بے پدر دشمنش کہ یزداں بآتش بسوزد تنش

تو ہمارا استعجاب اس کے انتہائی درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر فردوسی ان اشعار کا مالک ہے تو ہم کو ماننا ہوگا کہ یا تو اس کو سلطان سے صلہ کی کوئی توقع تھی ہی نہیں یا یہ کہ مذہبی جنون اس پر غالب تھا جس کے اثرات میں اس نے محمود جیسے جابر بادشاہ کے تعصباتِ مذہبی کی پروا نہ کرکے اس کے جلال اور دبدبے اور کرّوفرد مطلق العنانی

کو یک قلم فراموش کر کے صاف صاف اس کو خارجی بنا دیا اور اس کے منہ پر کہہ بھی دیا۔ تم اگر راہ خطا پر چلتے ہو تو تم خود اپنے دشمن ہو۔ حضرت علیؓ کا دشمن ایک بے پدر ہی ہو سکتا ہے جس کو خدا آتش جہنم میں جھونکے۔ اب یہ راہِ خطا کیا ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا دشمن کون ہے! خارجی فرقہ۔ فردوسی صلہ کی امید میں دربار سلطانی میں جاتا ہے نہ اس کو خارجی المذہب بیان کرنے اور بلا وجہ اشتعال دینے۔ اگر اس کو جنون نہ کہا جائے تو کیا سمجھا جائے۔ بے پدر (حرام زادہ) جیسے عریاں لفظ کا استعمال فردوسی نے انتہائی اشتعال کے موقعوں پر بھی نہیں کیا۔ دیباچہ میں ایسی بیباکی اس سے ناممکن ہے۔

ہماری خوش عقیدگی کو اس کے انتہائی مدارج تک پہنچا دینا ہے اگر ہم سے اس اعتقاد کی امید کی جائے کہ یہ اشعار فردوسی نے واقعتاً سلطان کو خطاب کر کے پڑھے تھے۔ اس سے میں یہ مان لینا ہزار درجے بہتر سمجھتا ہوں کہ وہ الحاقی ہیں اور فردوسی نے ہرگز نہیں لکھے۔

دیباچہ کے علاوہ شاہ نامہ میں دو تین مقام اور ایسے ہیں جہاں شیعہ رنگ کے اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً خاتمۂ داستانِ سیاؤش کے یہ ابیات :-

بدان گیتیم نیز خواہش گر است   کہ با ذوالفقار است و با منبر است

منم بندۂ اہل بیت نبی   سر افگندہ بر خاک پائے وصی

اور داستان نوش زاد[۱] کے خاتمہ کے یہ ابیات :-

---

[۱] شاہ نامہ کے ایک مخطوطہ نوشتہ ۸۵۵ھ میں اشعار ۲ و ۳ درج نہیں اور شعر ۱ حسب ذیل ہے:- اگر در دلت ہیچ حبّ علیست ؛ ترا روز محشر بخواہش نبیست

اگر در دولت ہیچ مہر علیؓ است (۱)، ترا جد شبرؑ بخواہش گریست
بمینو بدو رستہ گردیم و بس (۲)، در رستگاری جز او نیست کس
اگر در دلت زو بود ہیچ ریغ (۳)، بدان کو بہشت از تو دارد دریغ
دل شہریار جہاں شاد باد (۴)، ہمیں گفتۂ من ورا یاد باد
جہاں دار محمود جویائے حمد (۵)، کزو در ہمہ دل بود جائے حمد
سر تاج او شد ستون سپہر (۶)، ہمیشہ ز فرش فروزندہ مہر

داستان نوشنزاد فردوسی کے غزنوی کلام سے تعلق رکھتی ہے جیسا کہ سلطان کے مدحیہ ابیات سے صاف ظاہر ہے۔ یہاں پھر فردوسی سلطان کو اپنے مذہب کی تلقین کر رہا ہے اور بدقسمتی سے ایسی طرز میں جو ایک معمولی مستمع کو بھی ناگوار گزرے چہ جائے کہ ایک سلطان جابر و قاہر کو جو محمود کے پایہ کا ہو اور خود اپنے مذہب میں سخت ہو۔ حضرت علیؓ سے کینہ رکھنے والا خوارج کے سوا اور کوئی نہیں۔

ان اشعار کو بھی پہلے اشعار کی طرح میں الحاقی مانتا ہوں۔ مذکورۂ بالا وہ تمام عنصر ہے جس پر شاہ نامہ میں فردوسی کی شیعیت کی شہادت ختم ہو جاتی ہے۔

ہجو میں اس کی شیعیت کے اثبات کا مواد شاہ نامہ سے کہیں زیادہ ملتا ہے یہاں میں وہ اشعار بھی حوالۂ قلم کرتا ہوں ؎

مرا غمز کردند کان بد سخن (۱)، بمہر نبیؐ و علیؓ شد کہن
ہر آنکس کہ در دلش کین علیست (۲)، ازو خوار تر در جہاں گو کہ کیست
منم بندۂ ہر دو تا رستخیز (۳)، اگر شہ کند پیکرم ریز ریز
من از مہر ایں ہر دو شہ نگذرم (۴)، اگر تیغ شہ بگذرد بر سرم

نباشد جز از بے پدر دشمنش (۵) کہ یزدان بآتش بسوزد تنش
منم بندۂ اہل بیت نبی (۶) ستایندۂ خاک پائے وصی
نترسم کہ دارم ز روشن دلی (۷) بدل مہر جان نبی و علی
چہ گفت آن خداوند تنزیل و وحی (۸) خداوند امر و خداوند نہی
کہ من شہر علمم علیّم دراست (۹) درست این سخن قول پیغمبر است
گواہی دہم کین سخن راز اوست (۱۰) تو گوئی دو گوشم بر آواز اوست
چو باشد ترا عقل و تدبیر و رائے (۱۱) بنزد نبی و وصی گیر جائے
گرت زین بد آید گناہ منست (۱۲) چنین است و این رسم و راہ منست
باین زادہ ام ہم برین بگذرم (۱۳) چنان دان کہ خاک پئے حیدرم
ابا دیگران مر مرا کار نیست (۱۴) بدین در مرا جائے گفتار نیست
چو بر تخت شاہی نشاند خدائے (۱۵) نبیؑ و علیؑ را بدیگر سرائے
گر از مہر شان من حکایت کنم (۱۶) چو محمود را صد حمایت کنم
جہان تا بود شہریاران بود (۱۷) پیامم بر تاجداران بود
کہ فردوسی طوسی پاک جفت (۱۸) نہ این نامہ بر نام محمود گفت
بنام نبیؑ و علیؑ گفتہ ام (۱۹) گہر ہائے معنی بسے سفتہ ام

سلطان محمود کی ہجو بقول نظامی برباد کر دی گئی تھی۔ موجودہ ہجو ایک مجعول دستاویز ہی اور فردوسی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی اور نہ فردوسی کے عہد تک اس کی سراغ رسی ہو سکتی۔ اشعار نمبر ۵۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ شاہ نامہ کے دیباچہ سے منقول ہیں۔ بیت نمبر (۶) داستانِ سیاوش کے خاتمے پر ملتا ہی۔ نمبر (۱۵) شاہ نامہ کے قلمی نسخوں میں مل جاتا ہی اور یوسف زلیخائے فردوسی کے دیباچہ میں بھی منقول

ہے۔ ابیات نمبر (۱)، و (۱۳) نظامی کے چہار مقالہ میں ملتے ہیں۔

کیا یہ امر قابلِ حیرت نہیں کہ فردوسی شاہ نامہ میں امیر نصر کے سامنے جیساکہ اوپر دیکھا جا چکا ہے صرف دشمن کی بدگوئی کے بیان پر قناعت کرتا ہے اور کوئی تشریح نہیں کرتا کہ وہ بدگوئی کس نوعیت کی تھی۔ دیباچۂ قدیم صرف اس بیان پر قناعت کرتا ہے "کہ سخن در مذہب خود گفتہ" لیکن یہ بیان نہیں کرتا کہ وہ مذہب کیا تھا۔ فردوسی سے ایک اور نصف صدی بعد نظامی دعوے سے کہتا ہے کہ وہ بدگوئی فردوسی کا اعتزال اور شیعیت تھی جو ہجو کے اشعار میں محبت نبی و علی کے نام سے یاد کی گئی ہے۔ حقیقت میں اگر فردوسی کو اس بدگوئی کی اصلی نوعیت سے اطلاع ہوتی تو وہ امیر نصر کو ضرور اس سے واقف کرتا۔ اگر کوئی جھوٹی تہمت تھی تو اس کی تردید کرتا، اگر راست تھی تو عذر اور معافی کا خواستگار ہوتا۔ اس قدر ضرور ہے کہ وہ بدگوئی خواہ کسی قسم کی کیوں نہ ہو فردوسی اس اتّہام سے اپنے آپ کو بے قصور سمجھتا تھا۔ سلطان کی ناقدردانی کے باوجود وہ سلطان کی توجہ اپنے معاملات میں مبذول کرنے کا ساعی تھا کیونکہ امیر نصر سے وہ ملتمس ہے کہ آپ بھی میری اس محنت کی داد دیں اور سلطان سے سفارش کر کے میرے نہالِ امید کو بارور کریں۔ اگر یہ ناقدری فردوسی کے مذہب کی بنا پر تھی تو فردوسی امیر نصر کے ہاں ہرگز نہ جاتا کیونکہ خود امیر نصر اسی مذہب سے تعلق رکھتا تھا جو فردوسی کے نزدیک مذہبِ خوارج تھا۔

اعتزال اور شیعیت کی تہمت اگر واقعی فردوسی ایسا تھا تو کوئی ایسا گہرا راز نہیں تھا جو امیر نصر سے چھپایا جاتا کیونکہ نصر سے فردوسی

کے تعلقات خوش گوار تھے۔ شاہ نامہ میں کئی موقعوں پر فردوسی اس کی مدح سرائی کر رہا ہے اور اسی وجہ سے اس موقعہ پر وہ اس کے پاس جاتا ہے۔ شیعہ یا معتزلی ہونا ان ایام میں کوئی جرم نہیں تھا پھر کیا وجہ ہے کہ فردوسی نصر سے چھپاتا اور ہجو میں اس کو بیان کرتا ہے۔ میری دلیل یہی ہے کہ فردوسی اپنے بدگو اور اس کی بدگوئی کی نوعیت سے ناواقفِ محض تھا اس لیے وہ تو نہ جان سکا۔ لیکن فردوسی کے بعد میں آنے والی نسلوں نے ان اشعار کی تاویل کی غرض سے جو امیر نصر کے ذکر میں اس سے قبل مذکور ہو چکے ہیں اس کو مذہبی رنگ دے دیا کیونکہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ محض ان اشعار کی تشریح میں تذکرہ نگاروں اور فردوسی پرستوں نے یہ تمام طوفان بے تمیزی اٹھایا ہے ورنہ ہم عصر تاریخیں فردوسی اور مذہبی بنا پر سلطان کی اس کے ساتھ بدسلوکی کا ایک حرف بھی نہیں کہتیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ فردوسی نے ہجو کے ایک سو اشعار میں اُنیس بیس ابیات اپنی شیعیت کے اظہار میں صرف کیے ہیں۔ اگر مختلف ہجووں سے یہی اشعار فراہم کیے جائیں تو ان کی تعداد ساٹھ تک پہنچے گی۔ لیکن شاہ نامہ کے ساٹھ ہزار ابیات میں اسی رنگ کے اشعار کلہم اٹھارہ۔ اُنیس ملتے ہیں۔ ہجو کے میدان میں فردوسی کا یکا یک اس قدر جوشیلا شیعی ہو جانا نہایت غیر معمولی معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ شاہ نامہ کے دوران میں وہ اپنے اصلی جذبات کا اظہار سلطان محمود کے تعصب کی بنا پر نہیں کر سکتا تھا تو یہ کوئی سنجیدہ عذر معلوم نہیں ہوتا اس لیے کہ شاہ نامہ کے ضمن

ہیں بعض موقعوں پر نہ صرف اپنے مذہبی جذبات کا ذکر کرتا ہی بلکہ ساتھ ہی سلطان کو اس طرح خطاب کرتا ہی کہ گویا وہ خارجی تھا۔

شاہ نامہ کا اکثر حصہ طوس میں لکھا گیا ہی جہاں کوئی چیز فردوسی کو اپنے مذہبی جذبات کے اظہار سے مانع نہیں تھی لیکن تعجب سے دیکھا جاتا ہی کہ اس حصۂ شاہ نامہ میں (جو موجودہ شاہ نامہ کی ڈھائی جلدوں سے زیادہ ہی) صرف ایک موقعہ پر اس نے دو بیت منقبت میں لکھے ہیں۔ جو داستانِ سیاوش کے خاتمے میں ملتے ہیں اور جن کو میں اوپر نقل کر آیا ہوں۔ شاہ نامہ کا باقی حصہ (قریباً ڈیڑھ جلد) غزنی میں لکھا گیا۔ چنانچہ دیباچہ اور داستانِ نوشزاد اس نے غزنی ہی میں لکھے ہیں۔ انہی دو مقام پر منقبت کے سلسلے میں اس نے ایسے شعر بھی لکھے ہیں جن پر ہر سُنّی[1] اعتراض کر سکتا ہی تو کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ فردوسی کو غزنین پہنچ کر جو اہلِ تسنن کے زیرِ اثر تھا یہ بات یاد آئی کہ مذہباً میں شیعہ ہوں اور مجھ کو اپنے مذہب کا اظہار کرنا بھی ضروری ہی اور وہ بھی اس طریقے پر کہ جس سے دوسرے فرقہ کی دل آزاری ہو۔ میں کہتا ہوں کہ ایسی تنگ خیالی فردوسی جس کا اخلاقی معیار تمام شعرائے ایران سے بلند ہی بعید بلکہ محال ہی۔

ذیل میں اس قصیدے کا ذکر کیا جاتا ہی جو مجالس المومنین میں قاضی نور اللہ شوستری نے فردوسی کی طرف منسوب کیا ہی۔ مجالس المومنین میں شیعہ شعرا کی فہرست میں فردوسی کو سب سے اوّل جگہ دی گئی ہی۔

---

[1] داستان نوش زاد کے سنیوں کو ناراض کرنے والے دو شعر قلمی نسخہ ۸۵۵ھ میں موجود نہیں جیسا کہ میں اس سے قبل اشارہ کر آیا ہوں۔

قاضی صاحب کا عقیدہ ہے کہ شاہ نامہ فردوسی نے طوس میں بنام نبی و علی لکھا تھا اور سلطان محمود کی خاطر اصحابِ ثلثہ کا ذکر تقیہ کر کے کر دیا۔ نبی و وصی کے نام پر شاہ نامہ لکھے جانے کا ثبوت قاضی صاحب ہجو کے ان اشعار سے دیتے ہیں :-

نہ ایں نامہ برنام محمود گفت — کہ فردوسی طوسی پاک جفت

گہر ہائے معنی بسے سفتہ ام — بنام نبیؐ و علیؓ گفتہ ام

اب موقعہ آگیا ہے کہ میں اس قصیدے کو ہدیۂ ناظرین کروں :-

اگر بری بخم زلف تاب دار انگشت

ز زلف خویش بر آری بزینہار انگشت

مگر شمارۂ زلف تو می کند شانہ

کہ کردہ در خم زلف تو بے شمار انگشت

گرہ کشود ز رگ ہائے جان خستہ دلان

چو کردہ زلف سیاہ تو تارتار انگشت

بحرف قتل من انگشت کش نہادی دوش

سرم فدائے تو زین حرف برمدار انگشت

سزائے شہد شہادت شہید عشق بود

جو یار تیغ بر آرد ولا بر آر انگشت

پئے نظارۂ مشکیں ہلال تو ہر ماہ

کشد مہ نو از ین نیل گون حصار انگشت

بمستی آرزوے پاے بوس او کردم

نہاد بر لب چون نوش خود نگار انگشت

دلا چو پیر شدی بگذر از ہوا و ہوس
زبہر آرزوئے نفس خود برآر انگشت
بگو کہ بود کہ شد فتح باب خیبر ازو
کہ کرد بر درِ آن قلعہ استوار انگشت
کہ پارہ کرد کمندِ نفاق و رشتۂ کفر
بگا ہوارہ کہ زد در دہان مار انگشت
علی عالی اعلیٰ کہ دست ہمت او
ہزار پی زدہ در چشم ذوالخمار انگشت
شہے کہ تا بدو انگشت در زخیبر کند
برآمد از پئے اسلام صد ہزار انگشت
شہے کہ زد بدو انگشت مرّہ را بدو نیم
برائے قتل عدو ساخت ذوالفقار انگشت
شہے کہ دلدل او را گہِ خرامیدن
بخارہ در نشدیش دست و پا چہار انگشت
ز تیغِ دست تو جان برد و زجہان ایمان
ہر آں کہ کرد بدین تو استوار انگشت
ز دست تیغ تو جاں بردے اربرآوردے
پئے شہادت دین تو ذوالخمار انگشت
کسے کہ حُبّ تواش نیست تا بروز شمار
بہر زہ گوی بہ تسبیح می شمار انگشت
کسے کہ دست بدامان حیدر و آلش
نزد بسا کہ بدنداں کند فگار انگشت

شہا تراست مسلم کرم کہ گاہ رکوع
کند برائے تو انگشتری نثار انگشت

کمینہ چاکر و مداح تست فردوسی
ہمیشہ با قلمش گشتہ دستیار انگشت

قبول کردہ غلامی قنبر تو بجان
نہادہ از مژہ بر چشم اشکبار انگشت

بزرگوار خدایا بحق حیدر و آل
در آن نفس کہ رود خلق راز کار انگشت

موالیان علی راز روئے لطف و کرم
ز ہول روز جزا بر قرار دار انگشت

شہا غلام غلام تو ام مرا مگزار
برائے فاقہ بہ آرم بزینہار انگشت [۵۱]

قاضی صاحب نے فردوسی کی شیعیت کا اس قصیدے سے ثبوت دیا ہے جس میں لطف یہ ہے کہ فردوسی کا تخلص تک موجود ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شاہ نامہ کی رُو سے فردوسی کی شیعیت کی شہادت قاضی صاحب کی نگاہ میں ناکافی تھی اس لیے یہ قصیدہ چونکہ میں واقف ہوں قاضی صاحب نے اکثر سنّی مشاہیر کو اپنی جماعت میں شامل کر لیا ہے اس لیے مجھ کو شبہہ ہوتا ہے کہ کہیں فردوسی کے ساتھ بھی وہی سلوک مرعی نہ کیا گیا ہو لیکن میں اس قصیدے کے متعلق چند نکات پیش کرتا ہوں۔

---

[۵۱] از مجالس المومنین

(۱) تمام دنیا تلاش میں ہے کہ فردوسی کا کلام بہ صورت قطعہ و قصیدہ و غزل دستیاب ہو۔ لیکن نو صدیاں گزرنے کے باوجود چند قطعات کے سوا جو اکثر قدیم و جدید تذکروں میں ملتے ہیں۔ ایک شعر بھی نہیں ملتا۔ قاضی صاحب نہایت خوش قسمت ہیں کہ ان کو پورا قصیدہ مل گیا۔ لیکن بد قسمتی سے انھوں نے اس کا کوئی ماخذ نہیں دیا۔ اس لیے یہ شبہہ کرنے کے لیے کافی گنجائش ہے کہ کہیں وہ مجعول نہ ہو۔

(۲) کلام پر نظر ڈالتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ قصیدۂ بالا کی زبان فردوسی کے عہد اور کلام سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ زبان کی یہ روانی بندشوں کی چستی۔ ترکیبوں کی لمبی نشست۔ کنایات و محاورات و اضافات زیادہ تر قاضی صاحب کے عہد میں پائے جاتے ہیں۔

(۳) ردیف جو فارسی شاعری کا اسلوب خصوصی ہے انگشت نمائی کر رہی ہے کہ فردوسی کے عہد میں عام طور پر اس کا رواج نہیں تھا اور نہ ایسی سنگلاخ زمینوں میں جس میں یہ قصیدہ لکھا گیا ہے ان ایام میں قصیدے لکھے جانے کا دستور تھا۔ دواوینِ عنصری۔ فرخی اور منوچہری کے تتبع سے یہ نکتہ آسانی کے ساتھ پایۂ ثبوت کو پہنچ سکتا ہے۔

(۴) تخلص کی موجودگی اس کی حالت کو اور بھی مشتبہ کیے دیتی ہے کیونکہ شعرا ان ایام میں اپنے تخلص کے استعمال کے پابندی کے ساتھ عادی نہ تھے۔ بالخصوص فردوسی اس بارے میں نہایت بے پروا ہے۔ شاہ نامہ میں دقیقی کے اشعار کے آغاز و اختتام پر دو جگہ اس کا تخلص ملتا ہے۔ لیکن قدیم نسخوں میں انھی اشعار میں "گوینده" تھا جس کی بجائے متاخرین نے فردوسی بنا دیا ہے۔
ایک اور مجعول قصیدہ جو فردوسی کی طرف منسوب ہے ذیل میں

حوالۂ قلم کیا جاتا ہے:-

ای دل ار داری ہوائے جنت الماوی بیا
در حریم کبریا بے کینہ و کبر و ریا
گر بقائے جاودان خواہی رہ عقبی گزین
ور سرائے خلد خواہی بگذر از دار الفنا
نعمت اسلام عامست و نہ خاص از بہر عام
خوان دین گسترده و در داده مردم را صلا
جہد کن تا ناسزا ہرگز نہ گوئی با کسے
ور بگوئی ناسزا یابی جزا روز جزا
عاقل دنیا و دینی آنکہ از علم و عمل
سنتِ احمد بجا آری و فرضِ کبریا
سنتِ احمد بود از حبّ اولاد رسول
زاں کہ فرضِ کبریا باشد ز حبّ مرتضیٰ
بگذرانی پایۂ قدر خود از ایوان عرش
گر بجا آری ز ایمان شرح شرعِ مصطفا
کے رسی ہرگز بسرِ حکمتِ عہد الست
تا نخوانی معنے آیات قرآں ہل اتیٰ
معنے قرآں کلام اللہ اگر دانی بحق
از پئے فصل ولی اللہ بر خوان انما
گر ہنر از تیغ بجوئی مجو جز ذو الفقار
ور حدیث از جود میگوئی مگو جز لافتیٰ

لافتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار

مادرِ شبیر و شبّر فاطمہ خیرالنسا

پس برین معنی نظیرش درجہاں ہرگز نبود

گر توگوئی بود در گیتی کہ این کی کجا

رو بتوریت کلیم و بشنو از بے چون کہ چون

خواند احمد میت میت و مرتضیٰ را عیلیا

دیدۂ تحقیق بکشا و بہ بیں عین الیقین

در ولا یاتش نشاں معجزات انبیا

گر خلیل اللہ نبود معجزہ اندر منجنیق

کاں زماں آمد درون نار نمرود از ہوا

گر شد اندر نار ابراہیم ہم خوش درگزشت

از سہ فرسنگ آتش مدین علی مرتضیٰ

ہم شنودی کز پئے فتح سلاسل بوالحسن

رفت اندر منجنیق و شد دراں حصن از قضا

گر کلیم حق بمعجز از سرِ چاہ شعیب

برگرفت و باز پشت افگند سنگِ آسیا

لام و جیم الف من از حصن حیدر در بکند

مرتضیٰ در باز پشت افگند چل گام از قضا

گر بموسیٰ داد بعد از مدتے دختر شعیب

در زماں دختر بہ حیدر داد شاہ انبیا

داد گر گے پاسخ یعقوب چوں پرسید ازو

بہر فرزند عزیز آں یوسف زیبا لقا

نیز با شیرِ خدا ہم گرگ آمد در سخن
از برائے گوسفند آن زنِ پیرِ دغا

صالح پیغمبر از معجز اگر بنتی گروہ
یک شتر آورد بیروں از صبیل گاہ دعا

حیدر از تل حصا آورد بیروں اشتراں
یک قطار او داد در قرض نبی فخر رجا

پس بسان موسیٰ و ہاروں بقرب و منزلت
ابن عم خواند او بہ معنی او زخود داماد را

ذوالفقار از بہر دفع کفر حیدر را بداد
ہم چناں از بہر دفع سحر موسیٰ را عصا

گر شد اندر دست داؤد نبی آہن چو موم
از برائے درع و دفع تیر در روز دغا

پیل آہن نیز حیدر ساخت در حال آوزہ
خورد شد ہم سنگ خارا در کفش چوں توتیا

راستی را گر بہ ملک اندر سلیمان نبی
مور را دانست دفعاً زد مرغاں را ندا

بوالحسن مفتی مور و مار و ماہی و وزغ
قاضی باز و کبوتر میسر نمل و اژدہا

گر ز روئے معجزہ مطلق بہر حدے نگر
از دمِ عیسیٰ مریم مردہ یا بیدے بقا

جمجمہ اندر زمیں با آب و ابقا کبر کرد
زندہ شد از نطق حیدر بعد چندیں سالہا

اندریں گردون گرداں قرص ماہ نور بخش
شد دو نیم از معجزات مصطفائے مجتبیٰ
از برائے طاعت عصرش علی را بازگشت
خسرو سیارگاں خورشید در اوج سما
چشم برکندہ بریدہ دست قصاب از دمش
شد درست و بہتر از اول بہ فرمان خدا
ایں ہمہ برہان و صد چندیں ز روئے راستی
گر برائے دیگراں داری بیاور انمّا
کہربا گر زانک باقیمت بود امّا ولے
نزد عاقل قیمتِ گوہر ندارد کہربا
گر بدانی نور حیدر ہم چو نور مصطفٰے
از خداوند جہاں آید بجانت مرحبا
چوں کنم شرحش چہ گویم چوں ہمی نالم ز درد
ہر زماں از درد جاں سوزِ شہیدِ کربلا
برنگردم از رہ حُبّ علی و آل او
از رہ حیدر بگردیدن خطا باشد خطا
ہر کہ برگشت از رہ حب علی و آل او
رفت و ماند او جاوداں در محنت و رنج و عنا
دولت جاوید فردوسی طوسی را بہ بیں
گفت مدح خانداں از ہمتِ آلِ عبا
ہیں اس قصیدہ کے متعلق کوئی رائے دینا نہیں چاہتا یہ

بالکل روشن ہی کہ اس قصیدے کو فردوسی سے کوئی علاقہ نہیں ہو سکتا۔ قصہ مختصر یہ وہ تمام شہادت ہی جس کی رُو سے فردوسی کی شیعیت کا ادّعا کیا جاتا ہی لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ یہ شہادت زیادہ تر ناقص اور غیر معتبر ہی۔

فردوسی کا اعتزال

شاہ نامہ کے دیباچہ میں حمد باری میں ایک شعر وارد ہوتا ہی ؎

بہ بینندگاں آفرینندہ را ۔ نہ بینی مرنجاں دو بینندہ را

اور شعر کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی ذات پاک کا مشاہدہ باصرہ کے ذریعہ سے ممکن نہیں اس لیے اپنی آنکھوں کو اس کے دیدار کی جستجو میں زحمت نہ دے۔ شاعر کا مطلب یہ ہی کہ ذات باری کا ادراک حواس کی معرفت نہیں ہو سکتا۔

علاوہ اور تفریقی مسائل کے جو اشاعرہ اور معتزلہ میں بحث و جدال کے مورث ہوئے ہیں ایک مسئلہ رویت باری ہی اشاعرہ کا اعتقاد ہی کہ قیامت کے روز خدا کا دیدار بلاکیف ہوگا وہ اپنے مذہب کی تائید میں یہ آیۂ کریمہ پیش کرتے ہیں وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربہا ناظرۃ۔ معتزلہ جن کا اعتقاد اس کے بالکل برعکس ہی اس آیۂ شریفہ سے متمسک ہوتے ہیں۔ لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر۔ اس آیت کی دلیل پر یہ معتزلی عقیدہ کہ دنیا و عقبیٰ میں خدا کا دیدار ناممکن ہی۔

شعرِ بالا کے استدلال پر نظامی عروضی فردوسی کو اہل اعتزال

سے مانتا ہے۔ میرے خیال میں کسی مسلسل نظم سے منفردہ شعر لے کر خاص معنی پہنا دینا اور پھر شاعر پر اعتراض کرنا صریح بے انصافی ہے بھلا اس شعر سے کون خیال کر سکتا ہے کہ فردوسی روبت کا منکر ہے۔ شاعر کا صحیح مفہوم دریافت کرنے کی نیت سے ہم کو شعرِ مذکور اس کے اور اشعار کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے تاکہ تسلسل قائم رہے یعنی اس طرح :۔

خرد گر سخن بر گزیند ہمی ہماں را گزیند کہ بیند ہمی

بہ بینندگاں آفرینندہ را نہ بینی مرنجاں دو بینندہ را

نیابد بدو نیز اندیشہ راہ کہ او برتر از نام و از جائے گاہ

شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ ہم ذات باری کے ادراک سے قاصر ہیں کیونکہ ہمارا تعقل انہی اشیا کے وجود کا قائل ہو سکتا ہے جو حواس کی معرفت اس تک پہنچیں لیکن ذات باری کا مشاہدہ آنکھوں سے نہیں ہو سکتا۔ حواس ایک طرف خدا کی ذات تو دائرہ تخیل کے تصرفات سے بھی بالا ہے۔

نظامی گنجوی جو اہلِ تسنن سے ہیں فردوسی کی تقلید میں قریب قریب یہی خیال ادا کر رہے ہیں چنانچہ :۔

بآں چیز ہا یابد اندیشہ راہ کہ باشد بدو دیدہ را دست گاہ

خدا را نشاید باندیشہ جست کہ در تست ہر چہ آں زاندیشہ رست

(سکندر نامہ بحری)

اب فردوسی ایک شعر کی بنا پر جس کا تسلسل توڑ دیا گیا ہے کیونکر معتزلی مانا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے استدلال کی ایسی مثال ہے جیسے

کوئی کہے کہ میں نماز اس لیے نہیں پڑھتا کہ قرآن مجید میں لاتقربوالصلوٰۃ آیا ہے اور وانتم سکارا ے کو بالکل چھوڑ جائے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کے ہاں یہ ایک مقبول خیال رہا ہے۔ شاہ نامہ میں کسی موقعہ پر فلاسفہ کی تردید اور بطلان میں کوشش کرتا ہوا فردوسی قریب قریب یہی مطلب یوں ادا کرتا ہے:۔

ایا فلسفہ دان بسیار گوے | نپویم براہے کہ گوئی بپوے
ترا ہرچہ بر چشم بر بگزرد | بر گنجد ہمی در دلت باخرد
چناں داں کہ یزدان نیکی دہش | جز آنست وزین برنگرداں منش
سخن ہیچ بہتر ز توحید نیست | بناگفتن وگفتن ایزد یکے است

فلاسفہ کے نزدیک وہی باتیں قابل قبول ہیں جو حواس کی معرفت ادراک میں آسکیں اور جن کو عقل باور کر لے۔ فردوسی کا یہ مقصد ہے کہ ذات باری کے ادراک کے لیے یہ طریقہ غلط ہے وہ سرحد ادراک اور اندیشہ سے بالا ہے۔

فردوسی کا تسنن

فردوسی کے تسنن کے متعلق اگرچہ کسی تاریخ میں کوئی شہادت نہیں اور نہ سنّیوں میں کوئی ایسی روایت ہے۔ شاہ نامہ میں کچھ ایسا ذخیرہ ملتا ہے جس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ سنت جماعت تھا۔ سب سے پیشتر دیباچہ کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

اگر دل نخواہی کہ باشد نژند | نخواہی کہ دائم بوی مستمند

چو خواہی کہ یابی ز ہر بد رہا ۔۔۔ سر اندر نیاری بدام بلا
بوی در دو گیتی ز بد رستگار ۔۔۔ نکو نام باشی بر کردگار
بہ گفتار پیغمبرت راہ جوے ۔۔۔ دل از تیرگیہا بدیں آب شوے
ترا دین و دانش رہاند درست ۔۔۔ رہ رستگاری ببایدت جست
چہ گفت آں خداوند تنزیل و وحی ۔۔۔ خداوند امر و خداوند نہی
کہ خورشید[۱] بعد از رسولاں مہ ۔۔۔ نتابید برکس چو بو بکر بہ
عمر کرد اسلام را آشکار ۔۔۔ بیاراست گیتی چو باد بہار
پس از ہر دو آں بود عثمان گزیں ۔۔۔ خداوند شرم و خداوند دین
چہارم علی بود جفت بتول ۔۔۔ کہ اورا بخوبی ستاید رسول
کہ من شہر علمم علیم دراست ۔۔۔ درست ایں سخن قول پیغمبر است
گواہی دہم کیں سخن راز اوست ۔۔۔ تو گوئی دو گوشم بر آواز اوست
بداں باش کو گفت و زیں برگرد ۔۔۔ چو گفتار و رایت نیاید بدرد
علی را چنیں گفت و دیگر ہمیں ۔۔۔ کزایشاں قوی شد بہر گونہ دیں
نبی آفتاب و صحاباں چو ماہ ۔۔۔ بہم نسبتے یک دگر راست راہ

ان کے علاوہ یہ اشعار شاہ نامہ میں اور ملتے ہیں ؎

(۱) بدو آفریں کو جہاں آفرید ۔۔۔ ابا آشکارا نہاں آفرید
خداوند دارندۂ ہست و نیست ۔۔۔ ہمہ چیز جفتست وایزد یکیست
بہ پیغمبرش بر کنم آفریں ۔۔۔ بیارانش بر ہر یکے ہم چنیں
(ساختن سیاوش کنگ دژ صفحہ ۱۲۰ جلد اول شاہ نامہ)

(۲) وزو بر روان محمد درود ۔۔۔ بیارانش بر ہر یکے بر فزود

۱؎ تلمیح ہے اس حدیث کی طرف "ماطلعت الشمس ولاغربت علی احد بعد النبیین افضل من ابی بکر"

همه پاک بودند و پرہیزگار سخن ہائے شاں برگذشت از شمار

(خاتمہ داستان اردشیر بابکاں۔ نیایش آفرینندۂ بے نیاز و مدح و ثنائے سلطان محمود صفحہ ۹۳ جلد سوم ۱۲۷۵ھ)

(۳) وزو بر روان محمد درود بیارانش بر ہر یکے بر فزود

(خاتمہ داستان سکندر۔ گلۂ فردوسی از آسمان و نیایش خدائے را صفحہ ۷۸ جلد سوم ۱۲۷۵ھ)

(۴) سپاس خداوند دانا کنم زبان و خرد را توانا کنم

توانا خداوند بر ہر چہ ہست خداوند بالا و دارائے پست

فرستم درود فرستادہ اش گزین گزینان آزادہ اش

محمد کہ بر بود نیہا سر اوست خداوند را از ہمہ روے دوست

کہ ایزد زیارانش خوشنود باد روان بد اندیش پر دود باد

(خاتمہ شاہ نامہ قلمی) یہ اشعار ایسے نسخوں میں ملتے ہیں جن میں اختتام شاہ نامہ کی تاریخ سنہ ۴۰۰ ہجری کے بجائے سنہ ۳۸۹ ہجری دی گئی ہے چنانچہ:۔

اگر سال نیز آرزوت آمدست نہم سال ہشتاد با سی صد است

مہ بہمن و آسماں روز بود کہ کلکم بدیں نامہ پیروز بود

(۵) حضرت عمرؓ خلیفۂ ثانی کے حق میں داستان یزد جرد کے آغاز میں یہ اشعار آتے ہیں۔

چناں بد کجا سرفراز عرب کہ از تیغ او روز گشتے چو شب

عمر آں کہ بد مومناں را امیر ستودہ ورا[۱] خالق بے نظیر

---

[۱] اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔ یا ایہا النبی حسبک اللہ ومن اتبعک من المومنین۔ من اتبعک سے مراد فاروقؓ اعظم ہیں۔

یہ تمام وہ مواد ہے جس کی رو سے فردوسی کو سنی بھی کہا جا سکتا ہے لیکن شاہ نامہ میں دونوں رنگ کے اشعار کی موجودگی کے کیا معنی۔ اس عقدہ کا حل یوں ہی ممکن ہے کہ یا تو فردوسی زیدیہ فرقہ کا متبع تھا یا اس کو اہلِ تسنن و تشیع نے اپنے اپنے مذہب کا رکن بنانے کی کوشش کی ہے اور نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دونوں مذہبیت کے اشعار شاہ نامہ میں ملنے لگے ہیں لیکن سنیوں کی فارسی ادبیات سے عام بے اعتنائی خصوصاً اپنے ہم مذہبوں کے خلاف ان کا تعصب ادنیٰ ادنیٰ اختلاف پر الحاد اور کفر و زندقہ کا الزام اور تہمت تراشنے کا ان کا عام انداز بھلا ان کو کب اجازت دیتا کہ مطعون فردوسی کی تصنیف میں وہ اپنے رنگ کے اشعار اضافہ کرنے کی زحمت گوارا کرتے۔ نظامی عروضی نے جب کہ اس کو شیعہ اور معتزلی بنانے پر قناعت کی تھی آشوب تورانی نے تو اسے گبر اور مزدکی بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا[۱۵] ہر قسم کی سبّ و شتم فردوسی کے حق میں استعمال کرتا ہے۔

میں چند اشعار پر قناعت کرتا ہوں۔ شاعر فردوسی کو خطاب کر رہا ہے:

نہ سنّی نہ شیعی نہ مغ نے جہود	نہ ترسا نہ دانم نژاد یں چہ بود
ز ہر مذہبے فارغ از ملحدے	ز دیرے بروں خارج از مسجدے
بہر مذہب و پیشہ جنگ و جدل	ز بحثت فگندن بہر دیں خلل
بہر علت از مرتدی و بدی	نجس بودی اکنوں نجس تر شدی

---

[۱۵] لیکن باخبر سنیوں میں وہ ہمیشہ مقبول رہا ہے چنانچہ امام احمد الغزالی۔ انوری نظامی گنجوی۔ صاحب راحت الصدور۔ صاحب مرزبان نامہ صاحب جہاں گشا۔ شیخ سعدی اور مولانا جامی اس کے مداح ہیں۔

ازیں پیشتر سعدی بے بدل | بحق تو گویا سرود ایں مثل
که گر چاہ نصرانیاں نیست پاک | بشوئی اگر مردہ گبرے چه باک[۱]

ازیں پیش شاید سخن گوے طوس | به دورغ سخن آبش از جوے طوس
مغ مغ نسب گبر آتش پرست | به بیعت بهر موبدے دادہ دست
کهن موبدے وجه نان مجوس | بهر دخمه مرثیه خوان مجوس
دلش گبر و جان گبر و گبری زباں | ز گبراں بگبری زباں قصه خواں
دل و دین بقربان کسریٰ کیش | ز اسلام بیگانه با کفر خویش
به انکارش از کعبه گم کردہ راہ | تراشیدہ آتش کدہ قبله گاہ
ز زردشت احکام دینش شد | پرستندۂ هیبر چوں هیبر بد
زبا ژند و ژندش بدل وعظ و پند | مفسر به تفسیر استا و ژند
بو خشوری مزدک و زردهشت | دروں دامن اعتقادش بهشت
مرادش ز زردشت پیر مغاں | براهیم پیغمبر اندر جهاں
شب و روز نازندہ بر تخت عاج | به زرینه کفش و به زرینه تاج
نویسندۂ داستان مغاں | بزرگی دہ خاندان مغاں

شاہ نامہ کے متعلق بھی آشوب کی رائے قابل ملاحظہ ہے کہا ہے۔

نه دانم جهاں را چه دنگی گرفت | که ملک سخن مست تنگی گرفت
ز فهم سخن دور بر رفتگاں | به تقلید هم سر بسر رفتگاں
نه پردہ بر قبح گفتار تو | نه بے لطفی و لطف اشعار تو

---

[۱] سعدی: اگرچه چاہ نصرانی نه پاک است
جهود مردہ می شویم چه باک است

ز ترکیب یک چند لفظ دری — ترا موجدے دیدہ در شاعری
بہ نظمت نہ خواندہ حروف زیاد — ز شہ نامہ ات قصہا کردہ یاد
ہمہ غافل از جا و بیجائے حرف — لقب دادہ ات اوستاد شگرف
مگر شعر فہمان ہمہ مردہ اند — ویا رخت فہم بیاں بردہ اند
کز ایران و توران و ہندوستان — یکے بر نیامد ز دانشوران
کہ بر سقم گفتار تو راہ یاب — کند آگہت از خطا و صواب
بالفاظ سست و زمخت و کرخت — چہ لازم شدت نظم شہنامہ گفت
ابا و ابر و ستا و بیشنا — حکیم این الفہائے زائد چرا[51]
ضیافت گر نکتہ سنجان دہر — نہ فرمودہ تمیز پا زہر و زہر
چنیں بد خورش خوانے آراستن — چنیں بزم بے لطف پیراستن
بطعن دقیقی ز گفتار تو — پسندم شد ایں بیت زاشعار تو
"دہاں گر بہ ماند ز خوردن تہی — ازاں بہ کہ ناساز خوانے نہی"

(صولت فاروقی)[52]

---

[51] مجھے شرم سے کہنا پڑتا ہے کہ الف زائدہ پر آشوب کا اعتراض قدیم زبان سے بے خبری پر مبنی ہے۔ اسی طرح اس کی باقی ہذیان سرائی کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔

[52] ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے ہم وطنوں میں بوجہ تصنیف شاہ نامہ جس کو ادب و شعر کی خدمت کے بجائے صریحاً مجوسیوں کی خدمت کے ساتھ تعبیر کیا گیا تھا بدنام تھا اور اسی بنا پر شیخ ابو القاسم طوسی نے (جن کو متاخرین نے ابو القاسم خرقانی لکھا ہے) اس کے جنازے کی نماز پڑھنے سے انکار کر دیا تھا وغیرہ۔ یہ قصہ اگرچہ دیباچۂ بایسنغر خانی کی وجہ سے ہمارے ہاں عام طور پر مشہور ہے لیکن اس کا کوئی قدیمی ماخذ معلوم نہ تھا۔ شیخ عطار کا اسرار نامہ ہماری موجودہ معلومات کی روشنی میں اس روایت کا سب سے قدیم ماخذ مانا جا سکتا ہے جس میں یہ تمام قصہ درج ہے۔ میں یہاں بعینہ اس کو حوالہ قلم کرتا ہوں۔

(باقی صفحہ ۱۳۵ پر)

یا بقول قاضی نور اللہ شوستری فردوسی نے تقیہ کر کے سنّی رنگ کے
اشعار بخوف سلطان محمود داخل کر دیے ہیں۔ لیکن اگر واقعہ ایسا ہوتا تو
شاہ نامہ میں صرف سنّی رنگ کے اشعار پائے جاتے نہ شیعہ رنگ کے

شنودم من کہ فردوسی طوسی — کہ کرد او در حکایت بے فسوسی
بہ بست و پنج سال از نوک خامہ — بسر می برد بیت شاہ نامہ
بآخر چوں رسیدش دم بآخر — ابوالقاسم کہ بد شیخ الاکابر
اگرچہ بود پیر پر نیاز او — نہ کرد از راہ دیں بروے نماز او
چنیں گفت او کہ فردوسی بسے گفت — ہمہ در حق گبرے ناکسے گفت
بہ مدح گبرگاں عمرے بسر برد — چو وقت مردن آمد بے خبر مرد
مرا در کار او برگ ریا نیست — نمازم بر چنیں شاعر روا نیست
چو فردوسی مسکیں را بہ بردند — بزیر خاک تاریکش سپردند
دراں شب شیخ او را دید در خواب — کہ پیش شیخ آمد دیدہ پُر آب
زمرد رنگ تاجے سبز بر سر — لباسے سبز تر از سبزہ در بر
بہ پیش شیخ بنشست و چنیں گفت — کہ ای جان تو با نور یقیں جفت
نہ کردی آن نماز از بے نیازی — کہ بے ننگ آمدت زیں بے نمازی
خدائے ما جہانے پر فرشتہ — ہمہ از فیض روحانی سرشتہ
فرستاد اینت لطف کارسازی — کہ تا گردند بر جانم نمازی
خطم دادند بر فردوس اعلیٰ — کہ فردوسی بفردوس است اولیٰ
خطاب آمد کہ ای فردوسی پیر — اگر راندت ز پیش آں طوسی پیر
پذیرفتم منت تا خوش بہ خفتی — بداں یک بیت توحیدم کہ گفتی
مشو نومید از فضل الٰہی — مدہ بر فضل ما بخلے گواہی
یقیں میداں چو ہستی مرد اسرار — کہ عاصی اندک است و مرد بسیار
گر آمرزد بیک رہ خلق را پاک — نیامرزیدہ باشد جز کف خاک
خداوندا تو میدانی کہ عطار — ہمہ توحید می گوید در اشعار
ز نور تو ساعی می نماید — چو فردوسی فقاعی می کشاید
چو فردوسی بہ بخشش رائگاں تو — بہ فضل خود بہ فردوسش رساں تو
بر فردوسی کہ علیینش خوانند — مقام صدق و نورانیش خوانند

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۶ پر۔)

کیوں کہ ایسی صورت میں فردوسی اپنے مذہب کو پوشیدہ رکھنے پر مجبور تھا پھر جب کہ ایک طرف فردوسی سلطان کے تعصب کے خوف سے اپنے آپ کو سنّی لباس میں ظاہر کر رہا ہے دوسری طرف شیعہ رنگ میں

لطف اس وقت تھا جب یہ بیان آشوب کی نگاہ سے گزرتا۔

اسلامی حلقوں میں فردوسی کی بدنامی کے اسباب زیادہ تر شاہ نامہ کے اس حصے سے تعلق رکھتے ہیں جو ایران پر استیلائے عرب کا مذکور کرتا ہے۔ مصنف پر الزام یہ ہے کہ اس نے عربوں کے ساتھ نہایت بے انصافی کی ہے۔ ان کے جس قدر کارنامے ہیں ان کو دانستہ ترک کر دیا یا نہایت خفیف کر کے دکھایا۔ اس طرح نہ صرف وہ عربوں کے قومی وقار کو پامال کرنے کا مجرم ہے بلکہ اسلامی جذبات کو بھی صدمہ پہنچاتا ہے۔ بعض اصول کا جو اسلام سے تعلق رکھتے ہیں اگر بے ادبی سے نہیں تو ادب سے بھی ذکر نہیں کرتا۔ مذہبی حلقوں میں اس پر بہت لعن طعن ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فردوسی کو ہمارے شیعہ بھائیوں نے اپنے طبقہ میں نہایت محترم جگہ دی اور قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں شیعہ شعرا کی فہرست میں پہلی کرسی ہمارے شاعر ہی کو دی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معاملہ ابتدا ہی سے ایک قسم کی غلط فہمی تھی جس کی نازک اور کمزور بنیاد پر الزامات کے عالی شان قصر تعمیر کر لیے گئے۔ فردوسی ایرانی شاعر تھا اور ایرانِ مرحوم کی عظمت اور شکوہ کی افسانہ خوانی کر رہا تھا۔ کتاب جو اس کے پیش نظر تھی پہلوی تھی یا پہلوی ذرائع سے تدوین ہوئی تھی۔ جس کا تمام نقطۂ نظر ایرانی بلکہ یوں سمجھو ساسانی تھا اور ہم جانتے ہیں کہ جب قومی فخر و مباہات کا صنم کدہ تعمیر ہو رہا ہے تو دوسرے قوموں کے کارناموں کی اس میں گنجایش نہیں ہوتی۔ جس حالت میں کہ رقابت کی آگ بھی زیر خاکستر ہو۔ فردوسی صنادید عجم کی تاریخ لکھ رہا تھا ساسانی ایران اور کیانی ایران کی مرثیہ خوانی کر رہا تھا وہ تاریخ عرب نہیں لکھ رہا تھا۔ علاوہ بریں اس معاملے میں اس کی حیثیت ایک ترجمان سے زیادہ نہیں تھی جو واقعات اس کو پہلوی ذرائع سے ملے وہی اس نے نقل کر دیے۔ اِن ذرائع میں جو زیادہ تر افسانہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور تاریخی نقطۂ نظر سے چنداں وقیع بھی نہیں۔ اگر جذباتِ عرب کے آبگینہ پر سنگ اندازی کی گئی تو ان کی ترجمانی میں فردوسی جس نے کہ ہم جان سکتے ہیں ان کی شدّت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۷ پر)

ایسے اشعار لکھ رہا ہے جس سے سلطان کو خارجی بنایا جا رہا ہے تو اس متضاد عنصر کی موجودگی میں تقیہ کا نظریہ ایک لمحہ کے لیے بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ یا وہ سلطان سے خائف تھا یا نہیں تھا اگر خائف تھا تو وہ سلطان

کے معتدل کرنے میں ایک حد تک جد و جہد بھی کی ہے عقلاً و انصافاً چنداں ملزم نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ بحیثیت مورخ اس کا یہی فرض تھا کہ جو واقعات اس کی روایات نے اس تک پہنچائے ہیں عیناً ذکر کر دے۔ مثلاً ایک معاند اسلام رستم سپہ سالار یزدجرد نے جب کہ وہ قادسیہ کی مہم کی تیاریاں کر رہا تھا اسلام کے بڑھتے سیلاب کو دیکھ کر عربوں کے لیے کہا۔ شعر

زیانِ کساں از پیٔ سود خویش بجویند و دیں اندر آرند پیش

(شاہ نامہ، جلد چہارم صـ ۱۲۱)

اور فردوسی نے اس قول کو نقل کر دیا تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ فردوسی کیوں متو جب تشنیع ٹھہرایا جائے۔ لیکن کچھ اسی قسم کے وجوہ تھے جن کی بنا پر فردوسی بدنام ہو گیا۔ ہمیں تعجب اس امر پر آتا ہے کہ عرب کی مذمت کے اشعار:۔

زشیر شتر خوردن و سوسمار عرب را بجائے رسید است کار
کہ تاج کیان را کنند آرزو تفو باد بر چرخ گردان تفو

سب کو یاد رہے لیکن وہ اشعار جو ان کے جواب میں ایرانی سفیر کو خطاب کر کے حضرت سعد بن وقاص کی زبان سے فردوسی نے ادا کیے کبھی شرمندۂ التفات نہ ہوئے۔ چنانچہ:۔

شمارا بہ مردانگی نیست کار ہمہ چوں زناں رنگ و بوی و نگار
ہنرتاں بدیباست آراستن دگر نقش بام و در آراستن

آخر وہ زمانہ آیا جب خدائے سخن کی حمایت میں ردِ عمل شروع ہوا۔ ایک روز امام احمد الغزالی نے اثنائے وعظ میں برسر ممبر حاضرین کو خطاب کر کے کہا کہ "اے مسلمانو تم کو وعظ و نصیحت کرتے مجھ کو چالیس سال کا زمانہ گزرا۔ اس دراز زمانے میں جو پند و نصیحت میں نے تم کو کی ہے۔ فردوسی نے اس کو ایک شعر میں ادا کر دیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

زروز گزر کردن اندیشہ کن پرستیدن دادگر پیشہ کن

(شاہ نامہ جلد اول صـ ۱۲۸)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۸ پر)

کو خارجی کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا اور اگر خائف نہیں تھا تو اس کو اپنے مذہب کے چھپانے کی ضرورت ہی نہیں تھی اور نہ سنّی عقیدہ کے اشعار کہنے کی حاجت۔

غزنین میں فردوسی کے تعلقات سلطان کے ساتھ جب تک کہ دشمن کی بدگوئی کا واقعہ پیش نہ آیا نہایت خوش گوار تھے۔ شاہ نامہ کی بعض داستانوں سے ثابت ہے کہ وہ سلطان کے سامنے سنائی گئی تھیں۔ داستان ہفت خوان اسفندیار سلطان کے سامنے پڑھی گئی ہے اس داستان کے خاتمہ پر فردوسی کہتا ہے:-

اگر شاہ پیروز بپسندد ایں نہادیم برچرخ گردندہ زیں

داستان اردشیر کی تمہید میں ایک شعر یوں آتا ہے:-

زساسان وبابک چہ داری خبر بخوان ہیں بشہ برہمہ سربسر

(از شاہ نامہ قلمی ۷۵۲ھ)

اور سلطان سے فردوسی کی اس قدر بے تکلفی ہوگئی تھی کہ اس سے فائدہ اٹھا کر اس نے بعض اوقات سلطان کو وعظ و نصیحت بھی کی ہے چنانچہ داستان اردشیر میں شاعر اردشیر کے انتظامات ریاست و قواعد ملکی بیان کر کے سلطان کو الفاظ ذیل میں خطاب کرتا ہے۔

زدانا سخن بشنو اے شہریار جہاں را بدیں گونہ آباد دار

اگر اس پر عمل کرو تو پھر تم کو کسی وعظ و نصیحت کی ضرورت نہیں۔
(بحوالہ مرزبان نامہ۔ باب سوم، داستان سہ رہزن انباز بابکریگز ص ۶۸-۷۷، طبع یورپ)
جب فردوسی کے اشعار منبر پر پڑھے جانے لگے ہیں تو ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ غیر مذہبی حلقوں میں شاہ نامہ اس عہد میں بہت کچھ مقبول ہو چکا ہو گا۔

چو خواہی کہ آزاد باشی ز رنج | بے آزار و آگندہ بی رنج گنج
بے آزاری زیر دستاں گزین | کہ یابی ز ہر کس بداد آفرین

داستان مہبود وزیر نوشیرواں کے اختتام پر شاعر ایک مرتبہ اور سلطان کو نصیحت کرنے میں مصروف ہے۔ کہتا ہے:۔

اگر داد گر باشی ای شہریار | نہ مانی و نامت بود یادگار
تن خویش را شاہ بیداد گر | جز از گور و نفریں نیارد بسر
اگر پیشہ دارد دلت راستی | چناں داں کہ گیتی تو آراستی
چو خواہی ستایش پس مرگ تو | خرد باید ای نامور برگ تو
چناں کز پس شاہ نوشیرواں | بہ گفتار من داد او شد جواں

نوشیرواں جب اپنے ملک کو چار حصوں میں منقسم کر کے رعایا و مزارعین کی بہبود کے لیے فرامین جاری کرتا ہے اس ذکر میں بوڑھا شاعر ایک مرتبہ اور سلطان کو خطاب کر کے کہتا ہے:۔

اگر داد گر باشی ای شہریار | بہ گیتی بہ مانی یکے یادگار
کہ جاوید ہر کس کند آفرین | بر آں شاہ کا باد دارد زمین

فردوسی اس پایہ کا شخص ہے کہ اپنے مذہب کو چھپانا یا تقیہ کرنا اس کے لیے ایک ہتک کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے سلطان محمود کے دربار میں ہر ملت و مذہب کے شخص کا گزر تھا۔ جو بادشاہ ہندووں کو اپنے لشکر میں اعلیٰ عہدے دے سکتا تھا کیا وہ ایک شیعہ شاعر کی موجودگی کا اپنے دربار میں روادار نہ ہوتا۔ بالخصوص جب کہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اسی سلطان نے ایک اور شیعہ شاعر یعنی غضائری رازی کو پیلیار انعام بخشی کی ہے۔ غضائری کہتا ہے ؎

امیدوارم کیں بارصد ہزار تمام   بہ من بیارد بر پائے فیل بر فیال[1]

ابوریحان البیرونی ایک اور شیعہ فاضل کو خود محمود نے خواہش کر کے اپنے دربار میں بلایا ہے۔ محمود کی دو لڑکیاں شیعہ شہزادوں منوچہر بن قابوس اور عنصر المعالی کیکاؤس کو بیاہی گئی ہیں۔ اس لیے فردوسی کے متعلق تقیہ کا خیال میرے نزدیک بالکل غیر موزوں ہے۔ شاہ نامہ میں ایسے اشعار کی موجودگی جو سلطان محمود پر خارجی ہونے کی تعریض کرتے ہیں صاف ظاہر کر رہی ہے کہ فردوسی ان اشعار کا قائل نہیں ہو سکتا کیونکہ فردوسی حقیقت میں اگر ایسا دیوانہ ہوتا تو محمود کے دربار سے اپنی جان سلامت نہیں لے جا سکتا تھا اس لیے میں اس عقیدے پر آیا ہوں کہ شاہ نامہ میں شیعہ عقیدے کے اشعار کا ادخال کسی غیر فردوسی کا کام ہے اور خود فردوسی سے ان کو کوئی تعلق نہیں جن حضرات نے اس کے نام پر قصائد شائع کیے ہیں کیا چند اور اشعار نہیں لکھ سکتے تھے۔

لیکن فردوسی کے مذہب کا مسئلہ طے کرنے کے لیے ہم کو کسی اور جدید شہادت کی ضرورت ہے جو بالکل غیر مشتبہ اور معتبر ہو۔ یہ شہادت بھی شاہ نامہ میں موجود ہے اور میں اس کا ذیل میں ذکر کرتا ہوں:۔

(۱) اشاعرہ و معتزلہ میں مسئلہ جبر و قدر سنگ تفرقہ انداز رہا ہے متکلمین کے نزدیک جبر ضد عدل ہے۔ اس سے ان کی مراد بندوں کی مقہوریت اور مغلوبیت ہے جس کے اثر میں ان کے تمام افعال مہد سے لے کر لحد تک گویا اقوال و افعال خدا ہیں جو ان کے ہاتھ اور زبان سے ان کے اختیار اور ارادے کے بغیر جاری کرتا ہے یعنی اعمال خیر و شر میں جو کچھ

---

[1] مسعود سعد سلمان کہتا ہے۔ مصرع "چوں لطف شاہ ماضی بر شاعر غضاری"

اس زندگی میں ہم سے سرزد ہونے والا ہی خدا نے اپنے علم ازلی کے مطابق ہماری تقدیر میں لکھ دیا ہی اور اس سے سرمو تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔

سعدی :۔
بہ بد بختی و نیک بختی قلم
بہ گردید و ما ہم چنیں در شکم

نظامی :۔
اگر نیکم وگر بدم در سرشت
قضائے تو ایں نقش بر من نوشت

اور خواجہ حافظ :۔
گناہ اگرچہ نبود اختیار ما حافظ
تو در طریق ادب کوش وگو گناہ منست

دیگر
در کوے نیک نامی ما را اگز رندادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضارا

یہ اشاعرہ کا مسئلۂ جبر ہی۔ صاحب گلشن راز کہتے ہیں ؎

ہر آں کس را کہ مذہب غیر جبر است
نبی فرمود کو مانند گبر است

یہ اس حدیث کی طرف اشارہ ہی کہ۔ القدریۃ مجوس ہذہ الامۃ۔

لیکن معتزلہ کا مختار یہ ہی کہ عباد اپنے اقوال و افعال میں فاعل و موجد ہیں۔ جبریہ کہتے ہیں کہ عباد فاعل بالایجاب ہیں نہ فاعل بالارادہ واختیار۔ خلاصہ یہ کہ معتزلہ انسانوں کو اپنے افعال کا مختار مانتے ہیں اور یہی ان کا مسئلۂ قدر ہی اور اسی بنا پر ان کو قدریہ کہا جاتا ہی۔ اب شیعوں اور معتزلیوں کا چولی دامن کا ساتھ ہی اکثر مسائل ان میں عام ہیں چنانچہ اس مسئلے میں دونوں فرقے متفق ہیں۔

محجوب لغام پردھما رمعدر

محمد باقر بن محمد تقی فرماتے ہیں :-

"و بندگان در فعل خود مختار اند و خود فاعل فعل خود اند خواہ اطاعت باشد خواہ معصیت و اکثر امامیہ و معتزلہ باین قول قائل اند و اشاعرہ کہ اکثر اہل سنت اند می گویند، فاعل ہمہ افعال بندہ خدا است و بندگان مطلق در آنہا اختیار ندارند بلکہ خدا بر دست ایشان افعال را جاری می کند و در آں فعل مجبور اند۔ اما بعضے از ایشاں میگویند کہ ارادۂ بندہ مقارن آں فعل می باشد اما آں ارادہ مطلقاً دخلے در وجود آں فعل ندارد و این مذہب باطل است " (از حق الیقین)

یہ شیعہ نقطۂ نظر ہے۔ ان مسائل پر نظر ڈالتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی معتزلہ کے برخلاف اشاعرہ کا ہم زبان ہے۔ تقدیر کے بارے میں فردوسی کا اعتقاد ہے کہ مشیت الہی نے جو کچھ ازل کے دن ہمارے مقدرات میں لکھ دیا ہے انہی احکام کے مطابق ہم چلتے ہیں وہ احکام ایسے طاقت ور اور زبردست ہیں کہ نہ ہم ان پر چون و چرا کر سکتے ہیں اور نہ ان سے احتراز کر سکتے ہیں۔ ان میں رد و بدل، تغیر و تبدل کے لیے سرمو گنجایش نہیں۔ اس کے حکم کے بغیر سانس تک نہیں لیا جا سکتا اور نہ پائے مور حرکت کر سکتا۔ تقدیر الہی کے آگے تدبیر انسانی کوئی چیز نہیں۔ نوشتۂ تقدیر اٹل اور اٹل ہے۔ حیلہ اور پرہیز سے کوئی تبدیلی اس میں پیدا نہیں کی جا سکتی۔ گویا انسان تقدیر خداوندی کے ہاتھ میں ایک کٹھ پتلی ہے وہ جس طرف اور جس طرح چاہتی ہے اس کو توڑتی اور موڑتی ہے۔

امثال از شاہ نامہ ؎

(۱) بدانگہ کہ لوح آفرید و قلم ۔ بزد بر ہمہ بودنیہا رقم
(صفحہ ۴۳ جلد اول)

(۲) کہ ہر چیز کو آفرید از بوش ۔ بدآنسو کشد بندگاں را روش
(صفحہ ۲۳، جلد چہارم ۔ فرستادن خاقان دختر خود را با نامہ و خواستہ ہمراہ مہران نزد نوشیروان)

یعنی جیسا ازل میں تقدیر کر دیا گیا ہے۔ اسی کے مطابق ہم چلتے ہیں۔

(۳) اگر زو مرا رنج خواہد فزود ۔ قلم رفت و این بودنی کار بود
یعنی جس بات پر قلم جاری ہو گیا ہے وہ ہو کر رہے گی۔
(صفحہ ۱۳۰، جلد اوّل۔ بخواب دیدن پیران سیاوش را و پیدا شدن خسرو)

(۴) ہمہ بندگانیم و او پادشاست ۔ خرد بر توانائی او گواست
نفس جز بہ فرمان او نگزرد ۔ پئے مور بے او زمیں نسپرد
(صفحہ ۲۱، جلد چہارم، پاسخ نامہ خاقان از انوشیرواں)

اس کی قدرت ایسی زبردست ہے کہ اس کی مشیت کے بغیر سانس تک نہیں لیا جا سکتا اور رینگنے والی چیونٹی کا پانو تک نہیں ہل سکتا۔

(۵) از و گر نوشتہ بمن بر بدی است ۔ نہ گردد بہ پرہیز کان ایزدی است
(جلد اوّل، صفحہ ۱۳۰)

اگر ہماری تقدیر میں کوئی برائی لکھی ہے تو ہمارے پرہیز سے وہ بدی ٹل نہیں سکتی۔

(۶) کہ کار خدائی نہ کاریست خورد ۔ قضائے نبشتہ نشاید سترد
نوشتۂ تقدیر مٹایا نہیں جا سکتا۔

(۷) نبشتہ بسر بر دگرگونہ بود　　زفرمان نکاہد نہ خواہد فزود

قضا چون زگردون فروہشت پر　　ہمہ زیرکان کور گردند و کر

(مولانا روم اس شعر کو یا اس کے عربی ماخذ کو مدنظر رکھ کر کہتے ہیں ؎

چون قضا بیرون کند از چرخ سر　　عاقلان گردند جملہ کور و کر)

(صفحہ ۲۴۴، جلد اوّل - پرسیدن سہراب نام و نشان سرداران ایران از ہجیر)

یعنی خدا کے حکم میں کوئی کمی و بیشی نہیں ہو سکتی جب قضائے الٰہی آتی ہے تو دانشمند اندھے اور بہرے ہو جاتے ہیں۔

(۸) نوشتہ چنین بود مان در بوش　　برسم بوش اندر آید روش

(صفحہ ۲۱، جلد اوّل)

(۹) چو یزداں چنیں راند اندر بوش　　بریں گونہ پیش آوریدم روش

(صفحہ ۲۵، جلد اوّل)

(۱۰) چنیں گفت دستان کہ دانا یکیست　　بہ تقدیر او راہ تدبیر نیست

(صفحہ ۶۳، جلد اوّل)

یعنی تقدیر کے آگے ہماری تدبیر بے کار ہے۔

(۱۱) بہ کوشیم و از کوشش ما چہ سود　　کز آغاز بود آنچہ بایست بود

(صفحہ ۱۵۲، جلد اوّل)

ہماری کوشش بیکار ہے جو ہونا ہے ازل کے دن مقرر ہو چکا ہے۔ *

(صفحہ ۹۶، جلد چہارم، کشتہ شدن بہرام چوبیں بدست قلون)

(۱۲) ز بخشش جہان آفریں بیش و کم　　نہ گردد بہ خیرہ مپیمائے دم

خدا نے جو ہمارا نصیبہ مقرر کر دیا ہے اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی اس پر گفتگو کرنا فضول ہے گویا ان معاملات میں فردوسی

* نوشتہ چنیں بود و بود آنچہ بود　　ز فرمان نکاہد نخواہد فزود

بحث کرنا بھی پسند نہیں کرتا چنانچہ ایک اور مقام پر کہتا ہے ؎

نوشتہ چنیں بود و بود آں چہ بود　　　سخن بر سخن چند خواہی فزود

(صفحہ ۶۷، جلد چہارم۔ رسیدن خسرو و بہرام چوبیں بہم دیگر و گفتگو با یک دگر کردن)

میں بخوفِ طوالت صرف انہی چند امثال پر قناعت کرتا ہوں ورنہ شاہ نامہ میں یہ جذبات و خیالات قدم قدم پر ملتے ہیں۔

(۲) معتزلہ جو اپنے آپ کو عدلی کہتے ہیں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ حکیم ہے اور حکیم سے خیر و صلاح کے سوا اور کچھ صادر نہیں ہو سکتا اور بحکم عقل رعایت مصالح عباد اس پر واجب ہے، پس خدا کی نسبت یہ اعتقاد کرنا کہ وہ اپنے بندوں کو اعمال خیر و شر پر اوّل تو مجبور کرے اور بعد میں ان کی پاداش میں سزا دے قبیح معلوم ہوتا ہے۔

محمد باقر بن محمد تقی فرماتے ہیں:۔

"حق تعالیٰ حکیم است و کارہائے او منوط بہ حکمت و مصلحت است و فعل عبث و بے فائدہ ازو صادر نمی شود او۔ را در افعال اغراض صحیح و حکمت ہائے عظیمہ ملحوظ می باشد ولیکن غرض در افعال الٰہی عاید بہ بندگان می گردد۔ غرض او تحصیل نفع از برائے خود نیست و بریں قول اتفاق کردہ اند امامیہ و معتزلہ و حکما۔ و اشاعرہ گفتہ اند کہ افعال خدا معلل با غراض نیست و آیات و احادیث بسیار بر بطلان ایں قول دلالت می کند۔

و اکثر امامیہ را اعتقاد آنست کہ آں چہ اصلح باشد از برائے خلق و نظام عالم، فعلش بر حق تعالیٰ واجب است"۔

(از حق الیقین)

برخلاف اس کے اشاعرہ کا عقیدہ ہے کہ بروئے عقل خدا پر کچھ واجب نہیں وہ قادر مطلق اور فعال مایشار ہے۔ وہ جو چاہے اور جب چاہے کرے کسی کو اس پر قدرت نہیں وہ چاہے تو چھوٹی چیز کو وسیع کر دے اور وسیع کو سمیٹ دے جس کو چاہے بلند کرے اور جس کو چاہے پست کرے۔ ذلیل کو عزّت دے اور عزت والے کو ذلیل کر دے جس کو چاہے راہ راست پر لائے اور جس کو چاہے سیدھی راہ سے الگ کر دے جسے جو چاہے دے اور جو چاہے چھین لے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے یا کرے گا وہی عدل اور انصاف ہے۔ نفع و ضرر اس کے ہاتھ میں ہے اس کی مشیت اور ارادے کے بغیر کچھ ہو نہیں سکتا۔ اللہ عزوجل پر ثواب یا عذاب یا بندے کے ساتھ لطف یا اس کے ساتھ وہ کرتا جو اس کے حق میں بہتر ہو کچھ واجب نہیں۔ مالک علی الاطلاق ہے جو چاہے کرے اور جو چاہے حکم دے اس پر کوئی جور و حیف لازم نہیں آتا۔

اس روشنی میں دیکھتے ہوئے فردوسی اشاعرہ کا ہم زبان ہے اس کے نزدیک ذات باری قادر علی الاطلاق ہے نہ شیعہ اصحاب کی طرح اس کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ عزوجل پر اصلح واجب ہے اور نہ وہ یہ مانتا کہ نیکیوں کا خالق اللہ ہے اور برائیوں کا خالق انسان ہے ان میں سے ہر مسئلے میں وہ فرقۂ سنت والجماعت کا پیرو ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

(۱) یکے را برآری بہ چرخ بلند ‏ ‏ یکے را کنی خوار و زار و نژند
یکے را ز ماہ اندر آری بچاہ ‏ ‏ یکے را ز چاہ اندر آری بماہ
یکے را برآری و شاہی دہی ‏ ‏ یکے را بدریا بہ ماہی دہی

نہ با آنت مہر و نہ با اینت کیں — کہ بہ دان توئی ای جہان آفریں
جہاں را بلندی و پستی توئی — نہ دانم چۂ ہرچہ ہستی توئی
(صفحہ ۱۹۴، جلد دوم۔ گرفتار شدن خاقان و شکست خوردنِ تورانیان)

(۲) غم و اندہ و رنج و تیمار و درد — ز نیک و ز بد ہرچہ آید بہ مرد
کمی و فزونی و نیک اختری — بلندی و پستی و کند آوری
ز داد تو بینم ہمی ہرچہ ہست — دگر کس نہ دارد دریں کار دست

یعنی غم و رنج۔ درد و تکلیف۔ نیکی بدی۔ کمی بیشی۔ نیک بختی اور بد بختی۔ بلندی اور پستی جو انسان پر عارض ہوتی ہیں سب خدا کی طرف سے ہیں اور انصاف ہیں۔

(صفحہ ۷۰، جلد اول، کشتن رستم ارژنگ دیو را)

(۳) توانائی او راست ما بندہ ایم — ہم از راستی ہاش گویندہ ایم
یکے را دہد تاج و تخت بلند — یکے را کند خوار و زار و نژند
نہ با آنش مہر و نہ با اینش کیں — نہ میداند ایں جز جہان آفریں
(صفحہ ۹۴، جلد چہارم)

(۴) وزو ہست پیروزی و ہم شکست — بہ نیک و بہ بد زان بود کام دست
زمان و مکان و جہاں آفرید — پئے مور و کوہ گراں آفرید
خرد داد و جان و تن زورمند — بزرگی و دیہیم و تخت بلند
رہائی نیابد سر از بند او — یکے را بود فرو اورند او
یکے را دگر شور بختی بود — نیاز و غم و درد و سختی بود
ز رخشندہ خورشید تا تیرہ خاک — ہمہ داد بینم ز یزدان پاک
(صفحہ ۱۶۲، جلد اول)

(۵) بد و نیک زاں داں کش انباز نیست — بہ کاریش فرجام و آغاز نیست

(صفحہ ۴۰، جلد چہارم) دیگر

ازویست نیک و بد و ہست و نیست — ہمہ بندگانیم ایزد یکیست

(صفحہ ۳۹، جلد اوّل) دیگر

تو مگذر از ہرگز رہ ایزدی — کہ نیکی ازویست و ہم زو بدی (دیگر)

بزرگی و خوردی بہ پیمان اوست — ہمہ بودنی زیر فرمان اوست (دیگر)

جز او را مخوان کردگار بلند — کزو شادمانی وزو مستمند (دیگر)

بد و نیک بیند ز یزدان پاک — وزو دارد اندر جہاں ترس و باک

(صفحہ ۱۰۳، جلد چہارم)

(۳) فرقۂ اہل تسنن و تشیع میں ہاروت و ماروت کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ ان فرشتوں کی بابت وہ قصہ جس سے ان کا بشری حیثیت اختیار کرکے دنیا میں آنا۔ لوگوں کو جادو کی تعلیم دینا۔ زہرہ پر عاشق ہونا اور اس کو اسم اعظم سکھانا مفہوم ہوتا ہے اور جو اہل سنت و جماعت میں مقبول ہے اہل تشیع نہیں مانتے۔ فردوسی کے ہاں شاہ نامہ میں ایک سے زیادہ موقعوں پر ہاروت کا ذکر آتا ہے اور اس طریقے سے آتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قصّے پر اس کا اعتقاد تھا۔ کیونکہ ان کی جادوگری کا وہ ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ:۔

گہے میگسارید و گہ چنگ ساخت — تو گفتی کہ ہاروت نیرنگ ساخت [لہ]

(تمہید داستان بیژن)

لہ ۸۵۵ھ کے ایک مخطوطہ میں پچھلا مصرعہ یوں ہے۔ ع
تو گفتی کہ ہاروت با او نواخت

شیعہ ہونے کی حیثیت سے فردوسی اس تلمیح کا استعمال نہیں کرسکتا تھا کیونکہ ہاروت و ماروت کا قصہ شیعوں میں غیر مسلّم ہے۔

(۴) سکندر کے حالات جو فردوسی نے شاہ نامہ میں دیے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر سنّی ماخذ سے لیے گئے ہیں کیونکہ اہم واقعات میں اس کے بیانات ثعالبی اور نظامی کے بیانات سے مطابق ہیں جبکہ تاریخ طبری اور روضۃ الصفا سے موافق نہیں۔

(۵) اسی طرح صوفیوں کے متعلق اس کی رائے اہل سنت والجماعت کے مطابق ہے۔ وہ ان کا ذکر موقر الفاظ میں کرتا ہے۔ سکندر کی داستان میں کہتا ہے ؎

غریباں کہ بر شہر ما بگذرند | چمانندہ پائے ولبان ناچرند
دل از عیب صافی و صوفی بنام | بہ درویشی اندر شدہ شادکام
زخواہندگاں نام شاں برکنید | شمار اندر آغاز دفتر کنید

(صفحہ ۶۰، جلد سوم)

واضح رہے کہ شیعہ جماعت میں ابتدا ہی سے اہل تصوف کی نسبت معاندانہ رائے قائم کرلی گئی تھی حتیٰ کہ ان کو مجوسی اور نصاریٰ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی تھی۔ جناب امام علی نقی کا قول ہے۔

"الصوفیہ کلھم مخالفونا وطریقھم مغایرۃ لطریقنا وان ھم الا نصاریٰ او مجوس ھذہ الامۃ" فرقۂ صوفی یہ سب ہمارے مخالف ہیں ان کا طریقہ ہمارے طریقے سے جدا ہے اور وہ اس امت کے نصاریٰ اور مجوسی ہیں۔

امام جعفر صادق کی رائے بھی ملاحظہ ہو:۔

"قال رجل للصادق خرج فی ھذا الزمان قوم یقال لھم الصوفیہ فما تقول

فیہم فقال انہم اعداءنا فمن مال الیہم فہو منہم ویحشر معہم وسیکون اقوام یدعون حبنا ویمیلون الیہم ویتشبہون بہم ویلقبون انفسہم بلقبہم و یاولون اقوالہم الا فمن مال الیہم فلیس منا وانا منہ براء ومن انکرہم و رد علیہم کان کمن جاہد الکفار مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہٖ"

(ترجمہ) امام صادق سے ایک شخص نے پوچھا کہ اس زمانے میں ایک فرقہ مبعوث ہوا ہے جس کو صوفی کہا جاتا ہے آپ کی ان کی بابت کیا رائے ہے آپ نے جواب دیا کہ وہ ہمارے دشمن ہیں جو ان کی طرف مائل ہوا وہ انہی میں سے ہے اور انہی کے ساتھ محشور ہوگا اور عنقریب ایسے لوگ بھی ہوں گے جو ہماری محبت کا دعویٰ کریں گے اور ان کی طرف میل کریں گے ان کے ساتھ مشابہت کریں گے ان کے القابات سے اپنے آپ کو ملقب کریں گے اور ان کے اقوال کی تاویلیں کریں گے۔ لیکن جو شخص ان کا مائل ہوا وہ ہماری جماعت سے تعلق نہیں رکھتا اور ہم اس سے بَری ہیں اور جس نے ان سے انکار کیا اور ان کی تردید کی اس کا رتبہ ایسا ہے گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہو کر کفار کے ساتھ جہاد کیا۔

ابو ہاشم کوفی صوفی کے متعلق جو بقول جامی سب سے پیشتر صوفی کے لفظ کو رواج دینے ہیں، بروایت امام حسن عسکری امام جعفر الصادق کی رائے حسب ذیل ہے:۔

"قال سُئل الصادق عن حال ابی الہاشم الکوفی الصوفی قال انہ فاسد العقیدۃ جداً"۔

امام جعفر الصادق سے ابوالہاشم الکوفی صوفی کے متعلق استفسار

کیا گیا آپ نے فرمایا کہ وہ سخت بد عقیدہ ہے۔

ان محترم ہستیوں کے اس قسم کے صریح اعلانات کے برخلاف شیعہ حلقوں میں تصوف کے لیے کسی سرسبزی کی امید رکھنا ناممکن تھا ایک مدت دراز تک یہی حالت قائم رہی لیکن پچھلے چند قرون میں سیاسی اسباب کے زیرِ اثر متصوفین کے لیے احترام کے آثار صفویہ کے زمانے سے شروع ہو جاتے ہیں کیونکہ اس خاندان کے اجداد شیخ صدر الدین موسیٰ اور شیخ صفی الدین اسحق بن جبرئیل خود صوفی تھے۔

(۶) یہاں ایک اور غیر متعلقہ امر کے متعلق چند الفاظ کہنا مناسب ہوں گے۔ کتاب یوسف و زلیخا بقول جمہور فردوسی کی تصنیف ہے اگرچہ اس اعتقاد میں میں شریک نہیں تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ فردوسی کی تصنیف ہے تو یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کے ذرائع وہی روایات ہیں جو اصحاب سنت و جماعت کے ہاں شائع ہیں۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ اس کا مصنف سنّی ہے نہ شیعہ۔ میں ان متعدد دلائل سے جو مصنفِ کتاب کے سنّی ہونے کے نظریہ کے حق میں پیش کی جا سکتی ہیں، بخوف طوالت صرف ایک روایت پر اکتفا کرتا ہوں۔

مثلاً وہ موقع جہاں زلیخا عشرت خانہ تیار کروا کر حضرت یوسف کو بلواتی ہے اور طالبِ وصال ہوتی ہے۔ اس موقعہ پر حضرت یوسف کے مائل ہونے اور ازار بند کی سات گرہیں کھولنے وغیرہ کے جو تفصیلی حالات اس تصنیف میں ملتے ہیں ان کا ناقل کوئی شیعہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تمام روایت اہل تشیع کے ہاں مردود ہے۔ جہاں شیعہ اصحاب نے سنّیوں کے خلاف اور اعتراض کیے ہیں وہاں یہ اعتراض

بھی کیا ہے۔ میں ان کی تصنیف "تبصرۃ العوام" سے ذیل کی عبارت نقل کرتا ہوں جہاں مولف نے سنیوں کے بیانات دے کر ان پر جرح کی ہے۔

"روایت کنند کہ چوں زلیخا قصد یوسف کرد و درِ خانہ بہ بست۔ یوسف نیز قصد فجور کرد۔ ناگاہ یعقوب را دید انگشت بدنداں گرفتہ و گفت یا یوسف ترا از انبیا می شمارند و تو قصد فجور میکنی و از سفیان بن عتبہ روایت کنند کہ گفت یوسف قصد فجور کرد بازلیخا و در موضعے نشست کہ مردان بازنان بہ قصد مجامعت نشینند و بہ روایت دیگر چناں در قدم ہائے زن نشست کہ مرد در حال مجامعت با حلال خود نشیند۔ ایں حکایت جملہ (سنیان) در تفاسیر خود یاد کردہ اند و ایں فواحش از تاویلات آیات قرآن استنباط کنند و بر انبیا و رسل بندند و گویند مذہب اہل سنت و جماعت است و ہر کہ خلاف ایں گوید اورا رافضی و بتدع گویند"

میں یہاں مثنوی یوسف و زلیخا کے وہ اشعار بھی درج کرتا ہوں۔

چناں آتشے بر دلش برفروخت — کہ مر شرم او را سراسر بسوخت
چو دل بر ہواجستنش میل کرد — سہ بند از گرہ زود بکشاد مرد
پس از کنج خانہ یکے دست دید — کشیدہ بہ کردار سیم سپید
ہمی بر کف او نوشتہ عیاں — کہ بیند ہمی کردگار جہاں
فرو خواند یوسف ولیکن ہواش — نہ کرد از گرہ برکشادن جداش
دو بند دگر برکشاد از میان — بہ فرمان اہرمن تیرہ جان
ز کنجے دگر باز دستے بدید — ہنر بند یوسف در و بنگرید
بران بد نوشتہ کہ ایں کار زشت — امیدت بہ بُرّد ز حور بہشت

فرو خواند یوسف ولیکن نہ داشت — بداں کز ہوا گام بیروں گزاشت
دل از کام جستن ہمی بر نتافت — سوے بند دیگر گشادن شتافت
بہ بخشود بر روے جہاں آفریں — فرستاد در وقت روح الامیں
بہ صورت چو یعقوب پرہیزگار — ہم از کنج خانہ شدش آشکار
بہ یوسف چنیں گفت کاے گنج ہوش — ز دو زرخ تن خویشتن دار گوش
زیعقوب آزردہ بشنو سخن — بدینسان گنہ زرد رویم مکن
بدیں گر شود چہرہ زرد م زتو — بہ یزداں کہ بیزار گردم زتو
چو یوسف رخ و چشم یعقوب دید — بداں ساں سخن گفتن ازوے شنید
چناں لرزش افتاد در دست و پاے — کہ در تن نماندش دل رہنماے [۱]

(صفحہ ۱۲۷، دار الطباعۂ خاصۂ مدرسۂ مبارکہ دار الفنون طہران)

ان بعض مسائل میں جو اتفاقیہ شاہ نامہ میں آگئے ہیں دیکھا جاتا ہے کہ فردوسی بالکل اہل تسنن کے ہمراے ہے اس لیے ان کے اثرات میں میں اس کو سنّی عقیدے کا مانتا ہوں۔

---

[۱] اس کے علاوہ جب ہم امام احمد غزالی طوسی (برادر امام غزالی) شیخ عطار اور نظامی گنجوی کے بیانات پر غور کرتے ہیں تو قرائن سے فردوسی کا اہل تسنن سے تعلق رکھنے کا استدلال صاف مترشح ہے۔ یہ تینوں بزرگ اہل سنت والجماعت کے ہاں اپنے اپنے مرکز میں بہ لحاظ شہرت و تقدس نہایت بلند پایہ رکھتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا مذہب کے ساتھ بہت قریبی تعلق رہا ہے۔ فردوسی کا ذکر یہ بزرگوار عزت کے ساتھ کرتے ہیں جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ فردوسی ان کے نزدیک اہل تسنن سے تھا۔ امام احمد غزالی کا بیان اور عطار کا حوالہ اسی مضمون کے ایک حاشیہ میں گزر چکا ہے۔ نظامی کے بیانات اقبال نامہ۔ شرف نامہ اور بہرام نامہ میں ملتے ہیں۔ راحۃ الصدور۔ جہان کشائے جوینی اور مرزبان نامہ وغیرہ میں شاہ نامہ کے اشعار کا کثرت کے ساتھ نقل کیا جانا اسی عقیدے کے تحت کا ایک اور قرینہ ہے۔

فردوسی کے اور عقائد کے متعلق جو شہادت شاہ نامہ سے مل سکتی ہے ناظرین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔ اگرچہ شاہ نامہ بہ لحاظ مضمون ایسی کتاب نہیں جس میں مصنف کو اپنے عقائد کے اظہار کا زیادہ موقعہ ملتا تاہم اس قدر یقینی ہے کہ اس کے معتقدات وہی تھے جو عام مسلمانوں کے ہوتے ہیں۔ وہ دین اسلام کو سب سے بہتر مذہب مانتا ہے اور نور ایمان سے اپنے دل کو روشن کرنا چاہتا ہے ؎

به گیتی در آں کوش چوں بگزری | سر انجام اسلام با خود بری
دل از نور ایماں گر آگندۂ | ترا خامشی بہ کہ گویندۂ

خدائے پاک کی ستایش اور اس کی توحید کی اشاعت فردوسی کا پہلا اور آخری سبق ہے جس کی تکرار سے وہ کبھی تھکتا نظر نہیں آتا۔ توحیدی مضامین کی کثرت سے اگر کسی نے شاہ نامہ کو قرآن العجم کہا ہے تو غیر موزوں نہیں کہا۔ فارسی میں مشکل سے کوئی ایسی کتاب ہوگی جس میں توحیدی مضامین اس کثرت سے پائے جائیں۔

جب کہ فلاسفہ کی زبان میں فردوسی خدا کو روح اور عقل کا خالق مانتا ہے جس نے مکان اور زمان خلق کیے، جو خورشید۔ قمر۔ زحل اور زہرہ کا مالک ہے۔ آسمانوں اور جہانوں کا خدا ہے۔ خاک۔ آب۔ آتش اور ہوا جس کی ہستی پر شہادت دیتے ہیں۔ فقہا کے ہم زبان بن کر گویا ہے کہ اس نے ایک کُن سے دونوں جہانوں کی تخلیق کی اور لوح و قلم پیدا کیے۔ وہ بے نیاز۔ دانا اور توانا بے سہیم و شریک اور بے مانند ہے اس کے احکام میں چون و چرا نہیں کی جا سکتی۔ ہم اس کے مجبور بندے ہیں۔ ہمارا فرض اس کی عبادت اور اس

کے احکام کی تعمیل ہے۔ خدا کی جناب میں اظہار عجز و نیاز کی تاکید وہ بار بار کرتا ہے۔ فردوسی کہتا ہے:-

وہ قادر مطلق ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ نہ اس کے یار ہے۔ نہ جفت ہے۔ وہ کبھی بہار پیدا کرتا ہے کبھی خزاں۔ درخت انگور کو وہی میوہ دیتا ہے، کبھی اس کو بہاریں کرتا ہے کبھی زرد رو۔ تمام عناصر اس کی ہستی کی گواہی دیتے ہیں۔ دستور۔ گنجور۔ تاج و تخت۔ کمی بیشی۔ خوش اقبالی اور بداقبالی سے بے نیاز ہے خشکی میں پیل اور آب میں نہنگ اس کے فرمان سے سرتابی نہیں کر سکتے۔ بدی اور نیکی سب اس کی طرف سے ہے۔ شمس و قمر اور زحل کا مصور۔ تخت و تاج کو رونق بخشنے والا۔ خاشاک سے شیر و پیل تک اور پائے مور کی گرد سے رود نیل تک اگر زمین سے آسمان تک پہنچ جائیں سب اسی کے حکم میں ہیں نہ اس کے حکم کی انتہا ہے اور نہ اس کی بادشاہی کو زوال ہے۔ دنیا کی چھوٹی بڑی چیز کا صانع۔ خاشاک سے عرش تک ہر ایک چیز اس کی ہستی کی شہادت دیتی ہے۔ چیونٹی سے شیر کو سزا دلواتا ہے۔ پیل زبردست پر پشہ کو غالب کراتا ہے وہ کیوان و بہرام و خورشید کا خداوند جس سے ہم کو امید و بیم ہے، اگرچہ میں اپنی جان تفکر میں گھلا دوں تب بھی میں اس کی حمد سرائی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ جیسا اس کا حق ستائش ہے ویسے کوئی اس کی ثنا نہیں کر سکتا اس لیے ہم کو اس کی بندگی کے لیے کمربستہ رہنا چاہیے، اس کی ہستی کا معترف ہو کر اس کی عبادت میں مصروف ہونا اس کے فرمانوں کی تعمیل کرنا اور اس کی بخشش کی امید رکھ کر گناہ سے خائف رہنا چاہیے اور اس کے پیغمبر پر درود بھیجنا چاہیے۔

یہاں شاہ نامہ سے بعض امثال پر قناعت کی جاتی ہے:-

(۱) بنام خداوند خورشید و ماہ   کہ دل را بنامش خرد داد راہ
خداوند ہستی و ہم راستی   نہ خواہد ز تو کژی و کاستی
خداوند کیوان و بہرام و شید   کز ویست امید و بیم و نوید
ستودن من او را ندانم ہمی   از اندیشہ جان بر فشانم ہمی
از ویست پیدا زمان و مکان   پئے مور بر ہستی او نشان
زگردندہ خورشید تا تیرہ خاک   ہمان باد و آب آتش تابناک
بہ ہستی یزدان گوائی دہند   روان ترا آشنائی دہند
سوے آفرینندۂ بے نیاز   ببایدکہ باشی ہمی در گداز
ز دستور و گنجور و ز تاج و تخت   ز کمی و بیشی و ناکام و بخت
ہم او بے نیاز است ما بندہ ایم   بہ فرمان ورایش سرافگندہ ایم
چو جان و خرد بیگمان کردہ است   سپہر و ستارہ بر آوردہ است
جز او را مدان کردگار بلند   کز و شادمانی و زو مستمند
شب و روز و گردان سپہر آفرید   خور و خواب و تندی و مہر آفرید

(۲) نگارندۂ ہور و کیوان و ماہ   فروزندۂ فر و دیہیم و گاہ
ز خاشاک ناچیز تا شیر و پیل   زگرد پئے پیل تا رود نیل
گر از خاک بر چرخ گردان روند   ہمہ زیر فرمان یزدان روند
نہ فرمان او را کرانہ پدید   نہ زو پادشاہی بخواہد برید

(۳) خداوند کیوان و خورشید و ماہ   کز ویست پیروزی و دستگاہ
خداوند ہستی و ہم راستی   از ویست بیشی و ہم کاستی
خداوند بخشندہ و کارساز   خداوند روزی دہ بے نیاز

خداوند گیتی خداوند مہر — خداوند ناہید و گرداں سپہر
جز از رائے و فرمان او راہ نیست — خور و ماہ ازیں دانش آگاہ نیست

(صفحہ ۱۳۸ جلد اوّل)

(۲) ستودن نداند کس او را چو ہست — میاں بندگی را ببایدت بست
بدیں آلت ورائے و جان و رواں — ستود آفرینندہ را کے تواں
بہستیش باید کہ خستو شوی — ز گفتار بیکار یکسو شوی
پرستندہ باشی و جویندہ راہ — بہ فرمان ہا ژرف کردن نگاہ

فردوسی سرائے جاودانی کا معتقد ہے اور کئی موقعوں پر اس کی نسبت تلمیح کرتا ہے ؎

چنیں گفت ما را سخن رہنمائے — جز اینست جاوید ما را سرائے (دیگر)
ہمیں بگذرد بر تو ایام تو — سرائے جز ایں باشد آرام تو (دیگر)
ز رفتن مگر بہتر آیدت جائے — چو آرام گیری بدیگر سرائے

سرائے جاودانی سرائے فانی سے بہتر ہے ؎

رہا کن ز چنگ ایں سپنجی سرائے — کہ پر مایہ تر زیں تراہست جائے

اس دنیا میں ہمارے نیک اعمال کا ثمرہ اُس دنیا میں ملے گا

تو تا زندۂ سوئے نیکی گرائے — مگر کام یابی بدیگر سرائے

(صفحہ ۸۰۳ جلد سوم)

جب ہم اس دنیا سے رحلت کریں گے خدا سے ہمارا سروکار ہوگا ہمارے اعمال خواہ اچھے ہوں یا بُرے ؎

چو رفتی سروکار با ایزد ست — اگر نیک باشدت کار ار بد است (دیگر)
گر رفتن آمد بدیگر سرائے — مگر نزد یزداں بہ آیدت جائے

وہ بہشت اور دوزخ کا معتقد ہے۔

اگر ماند ایدر ز تو نام زشت ۔۔۔ نیابی عفا اللہ خرم بہشت

(دیگر) نہ چوں من شدہ خوار و برگشتہ بخت ۔۔۔ بہ دوزخ فرستادہ ناکام رخت

رضواں مالک بہشت کا نام ان ابیات میں آتا ہے۔

بتان بہشتند گوئی درست ۔۔۔ بہ گلنار شان روے رضوان بشست

(صفحہ ۶۵)

توبہ پر بھی اعتقاد کامل رکھتا ہے

تو ای پیر فرتوت بے توبہ مرد ۔۔۔ درِ توبہ بگزیں و راہ خرد

ابلیس کا ذکر بھی کرتا ہے

چناں بُد کہ ابلیس روزے پگاہ ۔۔۔ یکے انجمن کرد پنہاں زشاہ

خانۂ کعبہ کا ذکر نہایت احترام کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خان حرم وہی ہے جس کو خدا بیت الحرام کہتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے بانی ہیں خدا نے اس کو بیت اللہ کہا ہے یہ اس مقام پاک کی حرمت کی بنا پر ہے ورنہ خدا کو کھانے پینے یا آرام کرنے کے لیے کسی گھر کی ضرورت نہیں۔ جب سے یہ پرستش گاہ تعمیر ہوئی ہے اس میں ہمیشہ خدا کی عبادت ہوتی آئی ہے

خداوند خواندیش بیت الحرام ۔۔۔ بدو شد ترا راہ یزداں تمام

زپاکی ورا خانۂ خویش خواند ۔۔۔ نیایش کنانرا بداں پیش خواند

خدائے جہاں را نیاید نیاز ۔۔۔ بجائے خور و کام و آرام و ناز

پرستش گہے بود تا بود جائے ۔۔۔ بدو اندروں یاد کرد خدائے

شاہ نامہ میں بیت المقدس کا بھی ذکر آتا ہے

بہ خشکی رسیدند سر جنگ جوے　　　بہ بیت المقدس نہادند روے

(صفحہ ۲۲، جلد اول، سنہ ۱۲۶۲ ہجری)

ظلمات میں سکندر کے جانے کے وقت وہ مسلمانی تکبیر اللہ اکبر کا بھی ذکر کرتا ہے

چو لشکر سوے آبحیواں گزشت　　　خروش آمد اللہ اکبر ز دشت

خضر علیہ السلام کو سکندر کا رہبر مانتا ہے

وداں اندریں خضر بُد رابزن　　　سر نامداران آن انجمن

سکندر بیامد بہ فرمان اوے　　　دل و جاں سپردہ بہ پیمان اوے

ظلمات سے واپسی کے وقت حضرت اسرافیل سے سکندر کی ملاقات کا ذکر بھی کرتا ہے

سرافیل را دید صورے بدست　　　برافراختہ سر زجائے نشست

پر از باد لب دیدگاں پر ز نم　　　کہ فرمان کے آید ز یزداں کہ دم

چو بر کوہ روے سکندر بدید　　　چو رعد خروشاں فغاں بر کشید

کہ اے بندۂ آز چندیں مکوش　　　کہ روزے بگوش آیدت یک خروش

تو چندیں مرنج از پئے تاج و تخت　　　بہ رفتن بیارا و بر بند رخت

کید ہندی کے خواب میں وہ دین اسلام کی ترویج کی پیشین گوئی بیان کرتا ہے

چہارم ز تازی یکے دین پاک　　　سر ہوشمنداں برآرد بخاک

اور اسی خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بھی بشارت دیتا ہے

ازیں پس بیاید یکے نام دار | زدشت سواران نیزہ گزار
یکے مرد پاکیزۂ نیک خوے | بدو دین یزداں شود چار سوے

وہ عبرانی تاریخ کو ایرانی تاریخ کے ساتھ جیساکہ بعض خوش عقیدہ مورخین کا دستور ہے تطبیق دینے کی کوشش بھی کرتا ہے اس عقیدے کا کہ حضرت ابراہیم اور زردشت ایک ہی شخص ہیں وہ بھی معتقد ہے۔

تہم دین زردشت پیشین بدوے | براہیم پیغمبر راست گوے

لیکن حضرت ابراہیم کے تقدم کا حضرت موسیٰ پر لحاظ نہ رکھ کر منوچہر کی زبان سے حضرت موسیٰ کی آمد کی بشارت نوذر کو ان ابیات میں دیتا ہے۔

نگر تا نتابی ز دین خداے | کہ دین خدا آورد پاک راے
کنوں نو شود در جہاں داوری | کہ موسیٰ بیاید بہ پیغمبری
پدید آید آں کس زخاور زمین | نگر تا نباشی ابا او بکین
بدو بگرو آں دین یزداں بود | نگہ کن ز سرتا چہ پیماں بود

تاریخ طبری میں منوچہر کو حضرت موسیٰ کا ہم عصر مانا گیا ہے۔

حضرت اسمعیل کا ذکر بھی ادب کے ساتھ کیا ہے۔

نبیرہ سماعیل پیغمبر است | کہ پور براہیم نیک اختر است

فردوسی کا بھی عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ پیغمبر تھے اور مصلوب نہیں ہوئے۔ چنانچہ ان کی نسبت کہتا ہے۔

پدر دیر او بود و مادر کنشت | نگہباں و جویندۂ خوب و زشت
چو روشن رواں گشت و دانش پذیر | سخن گوے و دانندہ و یاد گیر
بہ پیغمبری نیز ہنگام یافت | بہ برنائی از زیرکی کام یافت
تو گوئی کہ فرزند یزداں بداو | بداں دار برگشتہ خنداں بداو

بہ خندہ بریں بر خرد مند مرد | تو گر باہشی گرد یزداں بگرد
کہ ہست او بفرزند و زن بے نیاز | بہ نزدیک او آشکار است راز

نوشیرواں اپنی وفات کے قریب ایک خواب دیکھتا ہے جس کی تعبیر رسول مقبول کی ولادت اور ترویج دین اسلام ہے۔ یہ بھی فردوسی کے مسلمانی معتقدات کی دلیل ہے۔ نوشیرواں کے خواب کی روایت اکثر تاریخوں میں ملتی ہے۔ مگر فردوسی نے کسی قدر ضمنی اختلاف کے ساتھ بیان کیا ہے۔ تاریخ طبری میں عبد المسیح آکر سطیح سے اس خواب کی تعبیر دریافت کرتا ہے شاہ نامہ میں گزارندۂ خواب حکیم بوزرجمہر ہے۔[ل]
جنگ میں دشمنوں کے خلاف مارے جانے کے وقت متوفی کے لیے فردوسی کا بھی اعتقاد ہے کہ شہید ہوتا ہے۔

کسے کو بود کشتہ زیں رزمگاہ | بہشتی شود گشتہ پاک از گناہ

(صفحہ ۲۳، جلد اول، بمبئی ۱۲۷۵ھ)

پردے کا بھی شاہ نامہ میں مذکور آتا ہے۔

پس پردۂ او یکے دختر است | کہ رویش ز خورشید روشن تر است (دیگر)
کرا در پس پردہ دختر بود | اگر تاجدار و بد اختر بود

فردوسی مانتا ہے کہ ایک امر کن سے خدا نے دونوں جہان کو پیدا کیا۔

دو گیتی پدید آرد از کاف و نون | چرا نہ بفرمان او در نہ چون

اس کے ہاں لوح و قلم کا بھی ذکر موجود ہے۔

ل نوشیرواں کے خواب کی روایت تمام بایسنغری نسخوں میں ملتی ہے لیکن اس عہد سے قبل کے بعض شاہ ناموں میں جو میری نظر سے گزرے ہیں یہ خواب مذکور نہیں چنانچہ ۷۵۲ھ کے مخطوطے نیز ایک اور نسخے نوشتۂ ۸۵۵ھ میں نوشیرواں کا یہ خواب درج نہیں۔

ے بدآنگہ کہ لوح آفرید و قلم — بزد بر ہمہ بود نیہا رقم

خواب کے وجود میں عام مسلمانوں کی طرح اس کا بھی اعتقاد ہی وہ اس کو دانش پیغمبری کہتا ہی ے

نگر خواب را بیہدہ نشمری — یکے بہرہ دانش ز پیغمبری

رواں ہائے بیدار بیند بخواب — ہمہ بود نیہا چو آتش برآب

عربوں سے باوصف محبتِ ایران اس کو کوئی قومی عناد نہیں اگرچہ استیلاے عرب برعجم کے بیان میں بدقسمتی سے اس نے ایسی روایات سے کام لیا ہی جن میں عربوں کے ساتھ بے انصافی کی گئی ہی۔[۱] تاہم جہاں عربوں کی تعریف کی ہی وہاں فردوسی نے اس قوم کے مخصوصی خط و خال۔ ان کی حریت پرستی۔ رجز خوانی۔ فوری اشتعال۔ نیزہ بازی اور شمشیرزنی کے اوصاف کو فراموش نہیں کیا ہی چنانچہ ے

ے اگر شد فریدون چنیں شہریار — نہ ما بندگانیم با گوشوار

سخن گفتن و رنجش آئین ماست — عناں و سناں باختن دین ماست

بخنجر زمین رانیستان کنیم — بہ نیزہ ہوا رانیستان کنیم

عربی ضرب الامثال۔ محاورات اور مقولوں کو جو اس کے عہد

---

[۱] بایسنغری اڈیشن سے قبل کے بعض شاہ ناموں میں داستان یزدجرد سے ایسے ابیات جو صریحاً عربوں کے خلاف معاندانہ جوش کا اظہار کرتے ہیں خصوصیت کے ساتھ غیر حاضر ہیں جس سے شک گزرتا ہی کہ شاید اس قسم کے اشعار بعد میں اضافہ کردیے گئے ہیں۔ ایک نسخہ نوشتہٴ سنہ ۵۲، ہجری میں حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ اور رستم سپہ سالار یزدجرد کے درمیان جنگ کے واقعات کی تفصیل بایسنغری نسخوں اور مطبوعہ شاہ ناموں سے کئی امور میں مختلف ہی۔ خود اس داستان کی موجودہ ابتر حالت شاہد ہی کہ اس میں تصرفات کیے گئے ہیں۔

تک عام مسلمانی گفتگو میں رائج ہو چکے ہوں گے فردوسی اپنی زبان میں
کامیابی کے ساتھ تبدیل کر دیتا ہے اور اس ترجمے میں ضرور کچھ نہ کچھ جدت
بھی اضافہ کرتا دیکھا جاتا ہے۔

عربی امثال	فردوسی کا ترجمہ
اذا جاء القضا عمی البصر	قضا چوں زگردوں فرو هشت پر همه زیرکان کور گردند و کر
خیر الامور اوساطها	بکار زمانه میانه گزیں چو خواهی که یابی همی آفریں
طلب البعیر قرنین فضاع الاذنین	که خر شد که خواهد زگاوان سرو به یکبار گم کرد گوش از دو سو
الدنیا مزرعة الاخرة	یکے مزرع آں جهانست ایں نظر بر کشائے وحقیقت به بیں
من حفر بیراً لاخیه فقد وقع فیه	کسی قدر تبدیلی کے ساتھ کہا ہے۔ کسے کو بره بر کند ژرف چاه سزد گر کند خویشتن را نگاه
سید القوم خادمهم	چه گفت آں سخن گوے با ترس و هوش چو خسرو شدی بندگی را بکوش
الحق مر	نگر تا چه گوید سخن گوے بلخ که باشد سخن گفتن راست تلخ که گفتار تلخ ست با راستی به بندد به تلخی در کاستی

عربی امثال	فردوسی کا ترجمہ
من عاش بعد عدوہ	
یوماً فلقد بلغ المنا	
وان حیوۃ المرء بعد عدوہ	دم آبخوردن پس بدسگال
وان کان یوماً واحداً لکثیر	بہ از عمر ہفتاد و ہشتاد سال

العجلۃ من الشیطان	شتاب و بدی کار اہرمن است
	پشیمانی و رنج جان و تن است
	(صفحہ ۱۲۷، جلد اول)
جوّع کلبک یتبعک وسمّن کلبک یاکلک	سگ آں بہ کہ خواہندۂ نان بود
	چو سیرش کنی دشمن جاں بود
	(صفحہ ۱۱۳، جلد چہارم)

داستان آذر نوش میں ایک حدیث نبوی جس کے اصل الفاظ مجھ کو مل نہ سکے فردوسی یوں بیان کرتا ہے

چہ خوش گفت دیں آور تازیان ۔ کہ خشم پدر جانت آرد زیان

کسی اور عرب سردار کا قول فردوسی یوں نقل کرتا ہے

سپہ دار تازی سر راستان ۔ بریں بر بہ گوید یکے داستان

کہ تا زندہ ام چرمہ جفت منست ۔ خم چرخ گردوں نہفت منست

عروسم نباید کہ رعنا شوم ۔ بہ نزد خرد مند رسوا شوم

(صفحہ ۳۱، جلد اوّل)

اس قدر مطالعے کے بعد بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاہ نامہ میں اسلامی

مذہبیت کا عنصر کم پایا جاتا ہے اگرچہ ظاہر ہے کہ فردوسی کا مضمون ایک عجمی تاریخ تھی جس میں ان جذبات کے اظہار کا بہت کم موقع مل سکتا ہے۔ ساتھ ہی میں یہ بھی اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ فردوسی کی حیثیت زیادہ تر ایک دنیا دار مسلمان سے ملتی جلتی ہے جس کو مذہب کا شغف نہ ہو۔ وہ کوئی متقی اور دین دار مسلمان نہیں تھا اور نہ فقیہ اور عالم۔ مذہبی رنگ اس پر کبھی نہیں کھلا اور نہ اس میں انہماک رہا۔

وہ اپنے ملک کے رواج کے مطابق جیسا کہ ہم اس عہد میں عام طور پر دیکھتے ہیں شراب خواری کا عادی تھا۔ ناصر خسرو نے جب کہ چالیسویں سال اور امیر کیکاؤس نے اپنی عمر کے پچاسویں سال مے نوشی سے توبہ کرلی تھی۔ فردوسی نہ اس عہد میں اور نہ اُس عمر میں جیسا کہ شاہ نامہ سے معلوم ہوتا ہے توبہ کرتا دیکھا جاتا ہے بلکہ پیری اس نشاط سے لطف اٹھانے کے لیے اور بہانہ ہوگئی تھی ؎

چو پیری در آید زنا گہ بہ مرد — جوانش کند بادۂ سال خورد

گرا گوز شد پشت و بالاش پست — بکیوان برد سر چو شد نیم مست

اس نے اپنی عمر کے تریسٹھویں سال تک توبہ نہیں کی تھی چنانچہ ؎

چو شد سال گوینده بر شصت و سہ — مئے لعل پیش آورا ے روز بہ

اکثر داستانوں کے اختتام یا آغاز میں فردوسی کو شراب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ شاید نظامی نے دانائے طوس کی تقلید میں سکندر نامہ میں یہی شیوہ اختیار کیا ہے اگرچہ بہ تحقیق معلوم ہے کہ نظامی دخترِ رز کے گرفتاروں میں نہ تھے۔

مگر فردوسی کی شراب نوشی حافظ اور خیام کی طرح رندانہ اور مستانہ

نہیں ہی بلکہ وہ اس سے حظ حاصل کرکے نیم مستی پر ہی قناعت کرتا ہی۔

گرت ہست جامے مئے زرد خواہ بدل خرمی را مدار از گناہ
نشاط وطرب جوے ومستی مکن گزافہ مپندار مغز سخن (دیگر)
زمے نیز تو شادمانی گزیں کہ ست از کسے نشنو وآفریں

(صفحہ ۱۶، جلد چہارم)

فردوسی موت کے ذکر کے ساتھ شراب بھی یاد رکھتا ہی۔

اگر مرگ دارد چنیں طبع گرگ پر از مے یکے جام خواہم بزرگ

اپنے کسی ہاشمی دوست سے جو غالباً حسین قتیب ہی ایک موقعہ پر شراب طلب کر رہا ہی۔

مئے لعل پیش آور ای ہاشمی زخمے کہ بیشی ندارد کمی

بہار کی آمد اس کے دل میں شراب کا ولولہ پیدا کر دیتی ہی جیساکہ داستانِ رستم و اسفندیار کی تمہید میں دیکھا جاتا ہی۔

کنوں خورد باید مئے خوش گوار کہ می بوے مشک آید از کوہسار
ہوا پر خروش و زمین پر زجوش خنک آنکہ دل شاد دارد بنوش
درم دارد و نُقل و نان و نبید سرے گوسفندے تواند برید

عمر کے اکسٹھویں سال (۹) شراب سے تائب ہونے کا عزم مصمم کر رہا ہی۔

چو سالت شد اے پیر بر شصت و یک مئے و جام و آرام شد بے نمک
بگاہ پسیچیدن مرگ مے چو پیراہن شعر باشد بدے
فسردہ تن اندر میان گناہ رواں سوے فردوس گم کردہ راہ
زیاراں بسے ماند و بس درگزشت تو با جام ہموارہ بودہ بدست
باغاز اگر کار خود ننگری بفر جام ناچار کیفر بری

اس شصت و یک کا نسخہ ہفتاد و یک ہے جو میرے خیال میں یہاں زیادہ مناسب ہے۔

اسی زمانے کے قریب ایک اور مقام پر توبہ کے لیے تصمیم عزم کرتا پایا جاتا ہے۔

تو اے پیر فرتوت بے توبہ مرد — خرد گیر و ز بزم شادی بگرد
جہاں تازہ شد چوں فرح یافتی — رواں از در توبہ بر تافتی
اگر بخردی سوئے توبہ گرائے — ہمیشہ بود پاک دیں پاک رائے
پس از پیریت روزگاراں نماند — تموز و خریف و بہاراں نماند

اور یقین کیا جاتا ہے کہ اس موقعہ پر شاعر نے توبۂ نصوح کر لی ہے۔

فردوسی کی طبیعت کا رنگ دیکھتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ مذہب کے ماسوا جس چیز نے اس کے قلب پر اپنا سکہ جمایا تھا وہ حکمت اور فلسفہ ہے اس طرح اگر اس کا شمار حکمائے اسلام میں کیا جائے تو غیر موزوں نہیں ہوگا۔ بعض مصنفین نے اس کو حکیم لکھا ہے ان کا ایسا لکھنا صحیح معلوم ہوتا ہے۔

فقیہانہ طریق سخن میں خدا ارحم الرحمین اور قہار و جبار ہے۔ لیکن فلسفی طبع فردوسی شاہ نامہ کے پہلے صفحہ کیا بلکہ پہلے شعر میں خدا کو خدائے جان و خرد کہتا ہے جو نام و مقام سے برتر ہے اور جس تک پیکِ تخیل کو رسائی نہیں۔ حمد کے بعد دیباچہ کا دوسرا زینہ ستایش خرد ہے "اول ما خلق اللہ العقل" اگرچہ حدیث نبوی بتائی گئی ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ فلاسفہ کا ایک مسئلہ ہے۔ فردوسی کے نزدیک عقل آفرینش کا پہلا گوہر ہے۔ ع

نخست آفرینش خرد را شناس

اس خیال میں مولانا نظامی گنجوی بھی فردوسی کے ہم زبان ہیں۔ چنانچہ سکندر نامۂ بحری میں کہتے ہیں ؎

نخستیں خرد را پدیدار کرد ز نور خودش دیدہ بیدار کرد

خرد فردوسی کا قول ہے ایک بہترین خلعت ہے جو خدا نے انسان کو عطا کیا ہے۔ اس سے کونین میں انسان کی آبرو ہے۔ خرد کے بعد فردوسی روح کے ذکر میں مشغول ہے اور یہ ظاہر ہے کہ عقل کلی اور نفس کلی فلاسفہ میں بحث و جدال کے وسیع مضمون رہے ہیں۔ بو اطنہ کے ہاں بھی یہ مسائل ان کے فلسفہ کے اصل الاصول ہیں۔

آفرینش کا بیان جو فردوسی دیتا ہے وہ حکمائے یونان کے خیالات سے ملتا جلتا ہے۔ ابتدا میں کچھ نہیں تھا۔ نیستی سے خدا نے ہستی کی تخلیق کی۔ آغاز میں ایک جنبش ہوئی جس سے آتش پیدا ہوئی حرارت سے خشکی ظاہر ہوئی۔ سکون سے سردی نے ظہور پایا اور سردی سے تری کی تولید ہوئی۔ ان سے عناصر کی ولادت ہوئی۔ ایک آتش بلند ہوئی جس نے آسمانوں کو تو بر تو اور متحرک قائم کیا۔ بارہ برجوں اور سبعہ سیاروں کو افلاک پر جگہ ملی۔ آگ بلند ہوئی۔ باد و آب نے درمیان میں اور خاک نے سب سے نشیب میں مقام پایا۔ زمین ایک تاریک اور سیاہ مرکز تھی۔ آفتاب اس کے گرد گھومنے لگا۔ پہاڑ نمودار ہوئے۔ پانی کے چشمے ابلے۔ دریا و کوہ و دشت و راغ سے زمین روشن چراغ کی طرح معلوم ہونے لگی۔ جمادات کے بعد نباتات نے بروز کیا۔ گیاہ اور مختلف نوع کے درختوں نے بالیدگی شروع کی۔ ان کا سر نشیب میں ہے اور متحرک نہیں ہیں۔ اور نہ بالیدگی کے سوائے کوئی اور وصف ان میں موجود ہے۔ اب جنبش

کرنے والا یعنی حیوان سطح پر نمودار ہوا جو عالم نباتات پر متصرف ہوا۔ اس کا خاصہ یہ ہے کہ درخت کی طرح اس کا سر زمین میں نہیں ہے۔ اس کو کھانے، سونے اور آرام کرنے کی ضرورت ہے اور یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ نہ خدا اس سے عبادت چاہتا۔ لیکن آفرینش کا سب سے قیمتی اور آخری رکن انسان ہے اس کا قد راست ہے۔ نطق اور عقل دونوں اس کو عطا ہوئے۔ دد و دام اس کے مطیع ہیں۔ تخلیقِ انسان کی غایت کے سوال کو فردوسی خود چھیڑتا ہے اور کہتا ہے:۔

مگر مردمی خیرہ دانی ہمی | جز ایں را نشانے ندانی ہمی
ترا از دو گیتی بر آوردہ اند | بہ چندیں میانجی بہ پروردہ اند
نخستین فطرت پسین شمار | توئی خویشتن را بہ بازی مدار

کیا بشریت ایک بے کارشی ہے اور بس! نہیں اے انسان دونوں جہان میں تجھ کو شرف دیا گیا ہے اور متعدد وسائل سے تیری پرورش ہوئی ہے۔ آفرینش کی سب سے اول مگر شمار میں سب سے آخری مخلوق اے انسان تو ہے! تو اپنے آپ کو مہملات میں ضائع مت کر۔

چونکہ بعض فلسفیانہ معتقدات کی رُو سے انسانی مقدرات کی عنان مدبران فلکی کے سپرد کی گئی ہے اس لیے تخلیقِ انسان کے بعد فردوسی کو ہم افلاک کے ذکر میں مشغول دیکھتے ہیں۔ حکیم طوس ان معتقدات کو دہراتے ہوئے گویا ہے "اس تیز گھومنے والے گنبد کو دیکھو جس سے سب کو درد و درمان، تکلیف اور آسایش ملتی ہے۔ کسی وقت گردش سے اسے قرار نہیں نہ ہماری طرح تباہی پذیر ہے۔ ہمارے مقدرات کے خیر و شر سے وہ باخبر ہے۔"

نگہ کن بریں گنبد تیز گرد — کہ درمان ازویست وزویست درد
نہ از گردش آرام گیرد ہمی — نہ چوں ما تباہی پذیرد ہمی
ازوداں فزونی ازوداں شمار — بدو نیک نزدیک او آشکار

ان معتقدات کی معلوم ایسا ہوتا ہے کسی معترض نے تردید کی ہے۔ اعتراض غالباً نظم میں اور حاشیہ پر ہوگا۔ اس میں سے صرف ایک شعر جو غلطی سے متن میں داخل کر لیا گیا ہے اب تک موجود ہے۔ جو یہ ہے:۔

زیاقوت سرخ است چرخ کبود — نہ از آتش و آب و نز باد و دود

یاد رہے یہ شعر اسلامی نقطۂ نگاہ سے ہے لیکن فردوسی کے لیے کسی ایسے اعتراض کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ خود ان عقائد کی شاہ نامہ کے دوران میں ایک سے زیادہ موقعہ پر تردید و تکذیب کرتا دیکھا جاتا ہے۔

آسمان کی دورنگی۔ دنیا کی بے مہری اور زمانے کی بے وفائی جس طرح اور شعرا میں فردوسی کے ہاں بھی ایک مقبولہ موضوع رہا ہے جس کو وہ اپنی تصنیف کے دوران میں کہیں فراموش نہیں کرتا۔ ہم اپنی بداعمالیوں کا الزام شیطان کے سر تھوپتے ہیں۔ اسی طرح وہ ناگوار واقعات جو ہماری دسترس سے باہر ہیں اور ہم پر گزرتے ہیں تقدیر کے حوالہ کیے جاتے ہیں۔ فردوسی جس نے ہماری طرح شخصی سلطنتوں کی آب و ہوا اور استبداد کے سایہ میں پرورش پائی تھی سلطنت کی تعدّی۔ اکابر کے مظالم اور اسی قسم کے دیگر واقعات کو آسمانی تعدّی سے تعبیر کرتا ہے۔ مزید براں اجرامِ فلکی کی عالمِ سفلی پر تاثیرات کا عام عقیدہ اور تنجیم کی مشرقی ممالک میں عالم گیر مقبولیت اور ایسے اسباب ہو گئے تھے جنھوں نے اس فلسفہ کی بنیاد ڈالی تھی جس میں آسمان مختارِ کل اور فاعلِ مطلق تسلیم کر لیا گیا ہے۔

واقعات خیر و شر۔ کمال و نقصان۔ عشرت و آرام۔ درد و درمان سب افلاک کے علم اور ان کے قبضۂ قدرت میں مان لیے گئے تھے۔

یہ عقیدہ قدیم ہے۔ فارسی نظم میں اس کے جراثیم کی سراغرسی رودکی کے عہد تک کی جا سکتی ہے۔ اس عقیدے کی رُو سے آسمان نہ تباہی پذیر ہے اور نہ توالیِ حرکت سے خستگی محسوس کرتا ہے اور نہ مرورِ ایام سے فرسودہ ہوتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بعد میں اسی قسم کے اور اعتقادات اس میں منضم ہو گئے ہیں جن میں دنیا یا زمانہ فاعلِ کل اور مختارِ مطلق مانے گئے تھے۔ فردوسی کے ہاں یہ سب اعتقاد مخلوط شکل میں ملتے ہیں۔ ان تمام کی علیحدہ علیحدہ مثالیں دینا مضمون کو طوالت دینا ہے۔ میں صرف دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں:۔

اگر با تو گردوں نشیند براز — نیابی ہم از گردش او جواز
ہم او تاج و تخت بلندی دہد — ہم او تیرگی و نژندی دہد
بدشمن ہمی ماند وہم بدوست — گہے مغز یابی از و گاہ پوست
سرت گر بساید بابر سیاہ — سرانجام خاکست از و جایگاہ

(صفحہ ۵۲)

(دیگر) جہاں را ز کردار بد شرم نیست — کسے را بہ نزدیکش آزرم نیست
ہمیشہ بہر نیک و بد دسترس — ولیکن نہ جوید خود آرام کس

یہ عقائد شاہ نامہ میں بالعموم ہر مقام پر پائے جاتے ہیں اور اس کے اتباع میں تمام ایرانی شعرا میں یہ بدعت مقبول ہو گئی ہے۔ لیکن تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ متعدد مقامات پر فردوسی ان اعتقادات کی بطلان و تکذیب میں سرگرم ہے۔ اس کے اسلامی متعقدات ظن غالب ہے اس

جوں جوں شاہ نامہ کی منازل قطع ہونی شروع ہوتی ہیں۔ یونانی فلسفی برف کے تودے کی طرح تابش آفتاب سے پگھل کر غائب ہوجاتا ہے اور اس کے بجائے حقیقی فردوسی نمودار ہوتا ہے جو یاس و قنوط اور ام پرستی کے اثرات میں بالآخر حکمت سے اعتزال کر کے مذہب کے آغوش میں اپنے آپ کو سپرد کر دیتا ہے۔

حکمت سے فردوسی کی روگردانی کے دو بڑے وجوہ معلوم ہوتے ہیں۔ اوّل ہستی واجب الوجود جس میں اکثر فلاسفہ کو کلام رہا ہے۔ شاعر کسی فلسفی کو خطاب کر کے کہتا ہے۔

کہ تم جو ہر شے پر عقل کی عینک چڑھا کر نظر ڈالتے ہو یہ سلوک واجب الوجود کے ساتھ مناسب نہیں۔ گفتگو اور بحث تو کبھی ختم نہیں ہوسکتی لیکن اگر تم معقول پسند ہو تو راہ راست پر چلو اور مانو کہ ہماری دانش بیچارگی ہے اور خدا کی ذات ہمارے ادراک سے ماورا ہے۔ بس اسی قدر جاننا کافی ہے کہ خدا ہے اور ایک ہے۔ تم اپنی ذات کو بہت دور کھینچتے ہو لیکن یاد رہے کہ طرفۃ العین میں روح اور جسم میں مفارقت ہوجاتی ہے۔ زمانہ فانی ہے اور تمہارا اصلی ٹھکانا کوئی اور مقام ہے۔ سب سے مقدم خدا کی یاد کرو اور اس کی پرستش کرتے رہو جس سے افلاک قائم ہیں اور جو نیکی کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے ؎

ایا فلسفہ دان بسیار گوے	نپویم براہے کہ گوی بپوے
ترا ہرچہ بر چشم بر بگزرد	بہ گنجد ہمی در دلت با خرد
چناں داں کہ یزدان نیکی دہش	جز آنست وزیں برمگردان منش
تو گر سختۂ راہ سنجیدہ پوے	نیاید بہ بن ہرگز ایں گفتگوے

همہ دانش ما بہ بیچارگی است — بہ بیچارگاں بر بباید گریست
همیداں تو او را کہ ہست و یکے است — روان و خرد را جزیں راہ نیست
بہ یکدم زدن رستی از جان و تن — ہمی بس بزرگ آیدت خویشتن
ہمی بگذرد بر تو ایام تو — سرائے جز ایں باشد آرام تو
نخست از جہاں آفریں یاد کن — پرستش برین یاد بنیاد کن
کزو یست گردون گرداں بپاے — ہم او یست بر نیکوئی رہنماے

کسی اور موقع پر فردوسی پھر یہی گفتگو دہرا رہا ہے اور کہتا ہے کہ واجب الوجود کی ہستی میں نزاع کرنا اگر سوچو گے تو بے کار ہے۔ تمھارا پروردگار خدا ہے اور تم اس کے بندے ہو نہ وہ کھاتا ہے نہ وہ سوتا ہے۔ کور دل اور بے خرد ہی اس کی ہستی کے معترف نہ ہوں تو نہ ہوں مگر دانا ان کو انسان نہیں مانیں گے۔ تم اپنی دانش کے اعتماد پر اپنے آپ کو ضلالت کے گڑھے میں نہ ڈالو کیونکہ اس کی ہستی کی علامات اور آیات آب و خاک اور ہر شے سے ہویدا ہیں۔ وہ دانا توانا اور دارندہ ہے عقل اور نفس کا نقش بند وہی ہے جہان، مکان و زمان اس کی مخلوق ہیں۔ وہی پیل و پشہ کا خالق اور خورشید و ماہ کا خداوند ہے جو ظفر اور قدرت عطا کرنے والا ہے۔ راستی اور ہستی کا مالک۔ کمی اور افزونی کا ظہور پیرا۔ کامیاب بنانے والا۔ مہربان جو ہم کو رزق دیتا ہے درآں حالیکہ ہم سے بے نیاز ہے۔ عالم اور آفتاب۔ زہرہ اور آسمانوں کا خداوند جس کی رائے اور حکم کے سوا ہمارے لیے کوئی اور راستہ نہیں ؎

کنوں ای خردمند بیدار دل — مشو در گمان پاۓ در گش زگل
چو گردن باندیشہ زیر آوری — زہستی مکن پرسش و داوری

ترا کردگار یست پروردگار | توئی بندۂ کردۂ کردگار
نشاید خورد خواب با او نشست | کہ ختو نباشد بہ یزداں کہ ہست
دلش کور باشد زباں بیخرد | خرد مندش از مرداں نشمرد
زہستی نشانست بر آب و خاک | ز دانش مکن خویشتن در مغاک
توانا و دانا و دارندہ اوست | خرد را و جاں را نگارندہ اوست
جہاں آفرید و مکان و زمان | پے پشۂ خورد و پیل ژیان
خداوند کیوان و خورشید و ماہ | کز و یست پیروزی و دستگاہ
خداوند ہستی و ہم راستی | از و یست بیشی و ہم کاستی
خداوند بخشندۂ کارساز | خداوند روزی دہ بے نیاز
خداوند گیتی خداوند مہر | خداوند ناہید و گرداں سپہر

جز از رائے و فرمان او راہ نیست
خور و ماہ ازیں دانش آگاہ نیست

کشیدگی کا دوسرا باعث یہ ہے کہ فردوسی زندگی کے روزمرہ کے واقعات نیکی۔ بدی۔ راحت و آرام۔ بدبختی و نیک بختی۔ داد و بیداد الغرض ہر سوال کا جواب فلسفہ سے مانگتا ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ فلسفہ ہر شے اور ہر واقعہ کا علت و معلول بتا دے۔ مثلاً فردوسی یزدگرد آخری تاجدار ایران کے قتل کے خونیں واقعات لکھ کر ایک گہری فکر میں مستغرق دیکھا جاتا ہے۔ وہ سوچ رہا ہے کہ یزدجرد کے مارے جانے کو داد کہا جائے یا ستم۔ حق کہا جائے یا ناحق۔ اب فلسفہ اس کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ اگر دیتا ہے تو مبہم جس سے اطمینان نہیں ہوتا اور مشکل حل نہیں ہوتی۔ وہ کہتا ہے ؎

چنیں داد خوانیم بر یزدجرد | وگر کینہ خوانیم زیں ہفت گرد
وگر خود نہ داند ہمی کین وداد | مرا فیلسوف ایچ پاسخ نداد
وگر گفت مارا سخن بستہ گفت | بہ ماند ہمی پاسخ اندر نہفت

ایسے موقعوں پر دانائے طوس مذہب کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔ مثلاً داستان سہراب کی تمہید میں حسب معمول ہمارا شاعر فلسفیانہ خیالات میں مستغرق نظر آتا ہے۔ اس گہری فکر کے بانی نوجوان سہراب کا قتل اور اس کی بے وقت موت کے واقعات ہیں۔ ان پر وہ اس پیرایہ میں استدلال کرتا ہے کہ اگر بادِ صرصر ترنجِ خام کسی درخت سے گرا دے تو باد کے اس فعل کو داد کہا جائے یا بیداد۔ اچھا کہا جائے یا بُرا۔ اگر موت داد ہے تو بیداد کس چیز کا نام ہے اور جب داد مانتے ہو تو داد کے خلاف یہ واویلا کیسا۔ اب شاعر کہتا ہے کہ یہ خدائی راز ہے جس سے ہم کو لاعلمی میں رکھا گیا ہے۔ انسان بالطبع حریص ہے اس لیے یہ راز اس پر نہیں کھولا گیا۔ ممکن ہے کہ جب ہم یہاں سے رخصت ہوں اور سرائے جاودانی ہماری منزل گاہ بنے، ہماری حالت اس لحاظ سے بہتر ہو جائے ؎

اگر تند بادی بر آید ز کنج | بخاک افگند نارسیدہ ترنج
ستمگارہ خوانمش ار دادگر | ہنرمند گویمش ار بی ہنر
اگر مرگ دادست بیداد چیست | ز داد این ہمہ داد و فریاد چیست
ازین راز جان تو آگاہ نیست | بدین پردہ اندر ترا راہ نیست
ہمہ تا در آز رفتہ فراز | بکس وانشد این درِ راز باز
برفتن مگر بہتر آیدت جاے | چو آرام گیری بدیگر سراے

حکمت کے اس مقولہ کو کہ اگر موت نہ ہوتی اور توالد و تناسل کا سلسلہ

جاری رہتا تو زمین پر رہنے بسنے کو تو کیا انسان کو کھڑے رہنے کو بھی جگہ میسر نہ آتی فردوسی آغاز ہی میں تسلیم کر لیتا ہے۔ چنانچہ :-

اگر مرگ کس را نیو بار دے   ز پیر و جوان خاک بسیار دی

شاعر اپنے استدلال کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے۔ آگ کی خاصیت جلانا ہے۔ جلاتے وقت وہ نئی پرانی شاخ میں کوئی فرق نہیں کرتی۔ اسی طرح موت بھی جوان اور بوڑھے میں تمیز نہیں کرتی۔ صرف بڑھاپا موت کا باعث نہیں اس لیے جوان کو خوشی منانے کا موقعہ نہیں ہے۔ بہر حال اس دار رحلت میں جب موت قضا کے گھوڑے پر سوار آئے تو خوب سمجھ لو کہ اس کی آمد انصاف ہے اور بے انصافی نہیں۔

اگر آتشے گاہ افروختن   بسوزد عجب نیست ز و سوختن

بسوزد چو در سوزش آید درست   چو شاخ نو از شاخ کہنہ برست

دم مرگ چون آتش ہولناک   ندارد ز برنا و فرتوت باک

جوان را چہ باید بگیتی طرب   کہ نی مرگ راہست پیری سبب

درین جای رفتن نہ جای درنگ   بر اسپ قضا گر کشد مرگ تنگ

چنان دان کہ داد است و بیداد نیست   چو داد آمدش بانگ و فریاد چیست

مرگ اگرچہ انصاف ہے لیکن جواں مرگی بظاہر انصاف نہیں۔ فلسفہ اس کی عقدہ کشائی سے عاجز ہے۔ فردوسی مذہب کی طرف رجوع کرتا ہے اور مذہب اس کے کان میں کہتا ہے کہ یہ خدائی راز ہے اور فہم انسانی سے باہر۔ اگر ایمان کی سلامتی چاہتے ہو تو ان وساوس کو دل میں جگہ نہ دو۔ دین میں خلل ڈالنا منظور نہ ہو تو جوان اور بوڑھے کی موت میں کوئی فرق نہ کرو۔ خدا کی پرستش کرتے رہو اور اپنے آخری وقت کے لیے

طیار رہو اور کوشش کرو کہ خدا تمہارا خاتمہ اسلام پر کرے ؎

برین کار یزدان ترا راز نیست — اگر دیو با جانت انباز نیست

جوانی و پیری بہ نزد اجل — یکی دان چو در دین نخواہی خلل

دل از نور ایمان گر آگندۂ — ترا خامشی بہ کہ گویندۂ

پرستش ہمان پیشہ کن با نیاز — ہمہ کار روز پسین را بساز

بگیتی دران کوش چون بگذری — سر انجام اسلام با خود بری

یوسف وزلیخائے فردوسی

اس کتاب کا سب سے پہلا حوالہ شرف الدین یزدی کے ظفر نامہ تصنیف ۸۲۸ھ میں ملتا ہے قرشی کی فتح کے ذکر میں جو تیمور کے عجیب و غریب کارناموں میں مانی جاتی ہے شرف الدین لکھتا ہے:۔

"و این حکایتے است واقعی کہ صحتش بتواتر پیوستہ و در مجلس تحریر بعض ازان مردم کہ برای العین این احوال مشاہدہ کردہ اند بی مداہنت تقریر می کنند نہ از قبیل لاف و گزاف کہ فردوسی در شاہ نامہ برائے سخنوری و فصاحت گستری بر بعضی مردم بستہ و در نظم قصۂ یوسف علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام خود معترف شدہ و انصاف دادہ کہ نظم:۔

زہر گونہ نظم آراستم | بگفتم دران ہر چہ خود خواستم

اگرچہ دلم بود زان بامزہ ہمی کاشتم تخم و بیخ بزہ
ازان تخم کشتن پشیمان شدم زبان را و دل را گرہ برزدم
کہ آن داستانہا دروغ است پاک دو صد زان نیرزد بیک مشت خاک
برین می سزد گر بخندد خرد زمن خود کجا کہ پسندد خرد
کہ یک نیمہ از عمر خود گم کنم جہانی پراز نام رستم کنم
چہ باشد سخنہای برساختہ شب و روز زاندیشہ پرداختہ

والحق این معذرت و انصاف ازان بدیع مقال بی ہمال ہم از دلائل وفور فضل و کمال اوست ۔" (ظفر نامہ ص ۱۳۷ طبع سوسائٹی ۱۸۸۷ء)

اس کے بعد دیباچۂ بایسنغری میں، جو ۸۲۹ھ میں تالیف ہوتا ہے۔ متاخرین اس دیباچہ کے ذریعہ سے اس کتاب سے واقف ہوئے ہیں۔

دیباچہ نگار بایسنغرخانی اور اس کی تقلید میں دیگر تذکرہ نویس کہتے ہیں کہ فردوسی نے اہالی بغداد کی خوشنودی کے لیے اپنے قیام بغداد کے دوران میں مثنوی یوسف و زلیخا تصنیف کی یہ کتاب (طبع دارالطباعہ خاصۂ مدرسۂ مبارکہ دارالفنون طہران ۱۲۹۹ھ) اس وقت ہمارے پیش نظر ہو اس میں کوئی ایسی تصریح یا تلمیح موجود نہیں جس سے ظاہر ہو کہ وہ بغداد میں یا بغداد والوں کے لیے لکھی گئی تھی نہ اس کو کسی خلیفہ یا پادشاہ کی طرف منسوب ہونے کا دعویٰ ہی۔

مغربی مستشرقین میں ٹرنر میکن مرتب شاہ نامہ (کلکتہ) قابل ذکر ہو جس کا بیان ہو کہ فردوسی نے یہ کتاب والی عراق کے لیے تصنیف کی تھی۔ ڈاکٹر ایتھ جس نے یورپ میں اس مثنوی کا سب سے پہلا نتقدانہ ایڈیشن شائع کیا ہو۔ نیز پروفیسر براون کا عقیدہ ہو کہ یہ مثنوی

فردوسی نے مجد الدولہ ابو طالب رستم کے لیے لکھی تھی۔
لیکن یہ حقیقت فراموش نہیں کی جاسکتی کہ یوسف زلیخا جب کہ متاخرین میں مشہور رہی متقدمین میں اس کی شہرت جلوہ فروز طاق نسیاں رہی ہے اور نویں صدی ہجری سے قبل کی ایک سند بھی ایسی نہیں ملتی جو اس کتاب کا ذکر یا اس کا علاقہ فردوسی سے تسلیم کر سکے اگرچہ فردوسی اور اس کے شاہ نامہ کا ذکر متقدمین کے ہاں اکثر ملتا ہے اور یہ قضیہ ہمیں اس سوال پر آمادہ کرتا ہے کہ آیا موجودہ یوسف زلیخا فردوسی کی تصنیف کہلانے کی مستحق ہے یا نہیں کیونکہ ہمارے پاس بعض ایسے وجوہ ہیں جن کی بنا پر اس مسلّمہ عقیدے کو شبہ کی نظروں سے دیکھا جاسکتا ہے۔
بعض حلقوں میں یوسف زلیخا پر اعتراض ہوا ہے کہ اس کی زبان بہت کمزور ہے لیکن ساتھ ہی دفع اعتراض میں کہا گیا ہے کہ فردوسی بزم نگاری میں استاد نہیں بلکہ میدان جنگ اور رزمیہ کارنامے بیان کرنے میں اس کی طبیعت کا قدرتی رجحان تھا۔
کتاب یوسف زلیخا اگرچہ ایک ایسے مضمون پر لکھی گئی ہے جو اسلام میں مقبول رہا ہے اور کلام پاک میں حضرت یوسفؑ کے قصّے کا ذکر آنے سے اس کے ہر دلعزیزی کو اور بھی فروغ مل گیا ہے۔ لیکن صاحب قرآن العجم کی یوسف زلیخا کی جو قدر فارسی خواں دنیا نے کی ہے چنداں محتاجِ بیان نہیں، لوگ مشکل سے اس سے واقف ہیں۔ برخلاف اس کے یوسف زلیخائے جامی اس قدر مشہور ہے کہ بچّے سے لے کر بوڑھے تک سب اس کو جانتے ہیں حالانکہ تاریخی حیثیت سے دیکھتے ہوئے خواہ باعتبار قدامت خواہ بہ لحاظ روایتِ قصّہ، یوسف زلیخائے فردوسی

نہایت مستند اور یوسف زلیخائے جامی اس کے مقابلے میں بالکل بے وقر ہے۔ سبحان العجم کی تصنیف کے نامقبول اور ناپسند ہونے کی اصلی وجہ یہی ہے کہ وہ آگ جس کے لیے فردوسی مشہور ہے اس مثنوی میں بالکل خاموش ہے۔ نہ شاہ نامہ کی متانت برجستگی اور جدّت کا اس میں سراغ چلتا ہے۔

شاہ نامہ اور یوسف زلیخا کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم معلوم کرتے ہیں کہ دونوں کتابیں اگرچہ قریب العصر اور ایک شخص کی تصنیف ہونے کی مدعی ہیں لیکن طرزِ بیان اور زبان میں مختلف ہیں۔ شاہ نامہ جن باتوں کو عموماً اجمال کے ساتھ بیان کرتا ہے مثلاً تعریف حسن، یوسف زلیخا ان کو شرح و بسط اور تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ شاہ نامہ سے فردوسی کی خو، بو، مزاج پسند ناپسند اخلاقی نصب العین اور سوانح زندگی کے متعلق بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے لیکن زلیخا میں شاعر نے اپنی شخصیت کو اس حد تک چھپانے کی کوشش کی ہے کہ باوجود تمام کتاب پڑھ چکنے کے اس کی نسبت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

یہ ایک مسلّمہ عقیدہ ہے کہ فردوسی نے عربی الفاظ سے احتراز کرکے شاہ نامہ کو خالص دری زبان میں لکھا ہے۔ لیکن اس کی کوئی اصلیت نہیں شاہ نامہ میں سینکڑوں عربی الفاظ موجود ہیں فردوسی نے اس باب میں کوئی خاص اہتمام نہیں کیا بلکہ جس تناسب سے عربی الفاظ رودکی دقیقی اور دیگر معاصرین میں پائے جاتے ہیں اور جو زبانِ وقت میں رائج تھے اسی تناسب سے فردوسی کے ہاں بھی ملتے ہیں اس لیے اس بارے میں فردوسی کوئی استثنا قائم نہیں کرتا ہے بلکہ قاعدہ اس کے برعکس یوسف زلیخا میں عربی لغات کا استعمال ایک بڑی حد تک افراط کے ساتھ دیکھا

جاتا ہے۔ اگر واقعی فردوسی اِس نظم کا مالک ہے تو دشوار معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اس طرزِ رائج الوقت کو جو ساٹھ سترّ ہزار ابیات لکھنے کے بعد اس کی طبیعت میں بمنزلۂ طبیعتِ ثانیہ جاگزُیں ہو چکی ہو گی نغمۂ خارج از آہنگ سمجھ کر جدید روش اختیار کرتا جو کسی صورت میں نقشِ اوّل سے مستوجبِ ترجیح نہیں بلکہ اگر سچ پوچھا جائے تو ناقص کمزور اور غیر مستقل ہے۔

فردوسی کے ہاں بر خلاف دیگر اساتذہ کے اظہارِ مطالب میں تنوّع بوقلمونی اور رنگا رنگی نہایت محدود پیمانے پر ملتی ہے۔ جب کوئی خاص خیال اُس کو بار بار ادا کرنا ہوتا ہے تو دو چار مرتبہ مختلف پیرایوں میں اظہار کے بعد اس کی قوتِ معنی آفرینی ختم ہو جاتی ہے اور آیندہ اس خیال کے ادا کرنے کے لیے مجبور ہوتا ہے کہ وہی پرانا پیرایہ کسی قدر تبدّل اور تغیّر کے ساتھ یا بعینہٖ اسی شکل میں اختیار کرے، اس لیے تکرار شاہ نامہ کے دل کش چہرہ کا نہایت بدنما خال ہے۔ یہ نقص زیادہ تر اس عصر کی زبان کی ناداری اور افلاس کی بنا پر ہے لیکن مثنوی یوسف زلیخا میں یہی خامی ایک بڑی حد تک غیر حاضر ہے۔

یوسف زلیخا کے مقدمہ میں فردوسی گویا ہے کہ میں نے اکثر داستانیں اور پُرانے قصّے نظم کیے ہیں جن میں رزم بزم، دوستی عداوت، بلندی اور پستی سے بحث کی گئی ہے، عشاق کے حالات لکھے معشوقوں کا تذکرہ کیا، قصہ مختصر ہر قسم کی نظم لکھی۔ ان مشغلوں سے اگرچہ دل کو فرحت حاصل ہوئی لیکن واقع میں میں نے تکلیف اور گناہ کی کشت کاری کی جس سے پشیمان ہوں۔ دل اور زبان پر سکوت کی گرہ دیتا ہوں، آیندہ جھوٹے افسانے لکھ کر رنج اور معصیت کی تخم ریزی نہیں کروں گا اس لیے کہ

میرے بال سفید ہو چکے۔ فریدوں سے سیر ہوں مجھ کو کیا نفع اگر ضحاک تازی کا تخت اس نے چھینا۔ کیقباد اور اس کی مملکت سے دل گیر ہوں اور تخت کیکاؤسی برباد ہو چکا ہے۔ کیخسرو اور افراسیاب کی داستانیں لکھنے سے عذاب کے سوا اور کوئی پاداش نہیں مل سکتی۔ میری اس حماقت پر جس میں نصف عمر کھو کر رستم کا نام زندہ کیا اگر عقلا ہنسیں تو درست ہے۔ سہراب اور اسفندیار سے دل خستہ ہوں کیونکہ میرے شمشاد نما قد پر اب سوسن زار کھل آیا ہے۔ زمانے نے میرے چہرے سے مشک چُرا کر اس کے بجائے کافورِ خشک چھڑک دیا ہے۔ بازِ سفید نے یکایک آکر میرے کوّوں کو جان سے مایوس کر دیا ہے۔ یہ باز میرے باغ میں اوّل اِدھر اُدھر اُڑتا پھرا پھر زاغ کی نشست گاہ کو اس نے اپنی مستقل قیام گاہ بنا لیا، وہ کچھ ایسا جم کر بیٹھا ہے کہ کبھی نہیں اُڑے گا۔ میرا خیال تھا کہ باز زاغ کی خاطر آیا لیکن میں کیوں اپنے آپ کو شبہہ میں رکھوں اس کا صید زاغ نہیں بلکہ میں خود ہوں۔ اب مجھ کو دنیا کے اشغال سے دل اٹھا کر اپنی تدبیر کرنا چاہیے۔ دیوانوں اور نادانوں کا رویّہ ترک کر کے عقلمندوں کا شعار اختیار کرتا ہوں اور بقیۃ العمر بجز نیکی اور راہ راست پر گام زن ہونے کے کسی اور راستے پر قدم فرسائی نہیں کروں گا۔ داستانِ ملوک لکھنے سے توبہ کرتا ہوں، ان کے دربار سے سیر ہو چکا ہوں اور عہد کرتا ہوں کہ آیندہ لغو اور فضول داستانیں ہرگز نہیں لکھوں گا کیونکہ وہ قطعی غلط ہیں مستقبل میں انبیاء کرام کے قصص لکھوں گا اس لیے کہ ان کی اصل صدق پر مبنی ہے (ص ۱۲-۱۵)

اِس بیان سے ظاہر ہے کہ فردوسی تائب ہو کر زندگی کا ایک نیا

ورق لوٹتا ہی۔ وہ اپنے اس حصۂ عمر سے جو شاہ نامہ کی خدمت میں صرف
کیا پشیماں ہی۔ آستانِ ملوک اور دنیا کے اشغال سے بیزار ہوچکا ہی۔
چنانچہ اشعار ؎

کنوں چارۂ بایدم ساختن / دل از کارِ گیتی بہ پرداختن
گرفتن یکے راہ فرزانگاں / نہ رفتن بہ آئینِ دیوانگاں
سر از راہِ واژونہ برتافتم / کہ گم شد زمن عمر و غم یافتم
کنوں گر مرا روز چندے بقاست / دگر نسپرم جز ہمہ راہِ راست
نہ گویم دگر داستانِ ملوک / دلم سیر شد ز آستانِ ملوک ص۱۵

آخری شعر سے کم سے کم اس قدر ضرور مفہوم ہوتا ہی کہ یہ مثنوی کسی والی
امیر یا پادشاہ کے واسطے نہیں لکھی ہی بلکہ مذہبی اثرات سے اثر پذیر
ہوکر شاعر نے ایک دینی خدمت انجام دینے کی غرض سے لکھی ہی ؎

نہ گویم سخن ہائے بیہودہ ہیچ / بہ بیہودہ گفتن نہ گیرم بسیچ
چہ باشد سخن ہائے برساختہ / شب و روز زاندیشہ پرداختہ
ز پیغمبران گفت باید سخن / کہ جز راستی شان نبد بیخ و بُن ص۱۵

لیکن اب وقت آگیا ہی کہ ان بیانات کی صحت کا امتحان کیا جائے۔
فردوسی بہت کچھ تبدیل ہوچکا ہوگا جب اس نے زلیخا میں لکھا ؎

بریں می سزد گر بخندد خرد / زمن خود کجا کے پسندد خرد
کہ یک نیمہ از عمر خود گم کنم / جہانے پُر از نامِ رُستم کنم ص۱۴

پُور زال سے فردوسی کی بغاوت کے قصے پر۔ ہمارے کان مشکل
سے یقین کر سکتے ہیں اِسی رستم کے لیے شاہ نامہ میں کہتا ہی ؎

جہاں آفریں تا جہاں آفرید / سوارے چو رستم نیامد پدید

کسی دوسرے مقام پر گویا ہے ؎

کسے را کہ رستم بود پہلوان　　سزد گر بماند ہمیشہ جوان

شاہ نامہ کی نظم کے وقت فردوسی ان داستانوں کے لیے گویا ہے کہ تم ان کو دروغ اور افسانہ مت جانو اور واقعات کی رفتار کو اپنے زمانے کے معیار کے مطابق قیاس نہ کرو جو باتیں قرینِ عقل ہوں ان کو باور کرو باقی کی ترجمانی رمز اور ایما کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ شاہ نامہ ؎

تو ایں را دروغ و فسانہ مدان　　بہ یکساں روش در زمانہ مدان

ازو ہر چہ اندر خورد با خرد　　دگر بر رہ رمز و معنی برد

اساطیر عجمیہ کی نسبت شاعر کا یہ نقطۂ نظر معقولیت کا پہلو لیے ہوئے ہے لیکن زلیخا میں غیر ضروری سختی کے ساتھ قائل ہے ؎

کہ آں داستانہا دروغ ست پاک　　دو صد شاں نیرزد بیک مشت خاک

چہ باشد سخن ہائے بر ساختہ　　شب و روز زاندیشہ پرداختہ ص۱۵

یہ عام تکذیب اور تردید پہلے نقطۂ نظر کے مقابلے میں نہ صرف غیر منصفانہ بلکہ معاندانہ ہے کیونکہ شاہ نامہ کا وہ حصہ جو ساسانی بادشاہوں کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے، حقیقت میں صحیح تاریخ ہے نہ افسانہ۔ اس کو "دروغ پاک" یا "سخن ہائے بر ساختہ" جو محض تخیل کی امداد سے بنا لیے گئے ہوں کہنا صریح زبردستی اور ظلم ہے۔

فردوسی کو شاہ نامہ میں اپنی تصنیف پر ایک غیر معمولی فخر اور غرور تھا تمثیلاً سلطان محمود کو خطاب کر کے فخریہ لہجے میں یہ غیر فانی ابیات لکھتا ہے ؎

یکے بندگی کردم ای شہریار　　کہ ماند زمن در جہاں یادگار

بناہائے آباد گردد خراب ... ز باران واز تابشِ آفتاب
بنا کردم از نظم کاخے بلند ... کہ از باد و باران نیابد گزند
(جلد دوم صـ۲۳۵)

کسی اور موقع پر یہی جوشِ مفاخرت یوں ادا ہوا ہے ؎
بسے رنج بردم دریں سال سی ... عجم گرم کردم بدیں پارسی
(خاتمۂ شاہ نامہ قلمی ۵۲ ۵)

لیکن جب توبۂ نصوح سے ذوق یاب ہو چکا ہے خیالات میں ایک انقلاب عظیم مشاہدہ کیا جاتا ہے چنانچہ زلیخا۔ ابیات
ازاں تخم کشتن پشیمان شدم ... زبان را و دل را گرہ بر زدم
نگویم کنوں نامہا ے دروغ ... سخن را زگفتار ندہم فروغ صـ۱۲
ہم اُن دعاوی پر صدق دل سے ایمان نہیں لا سکتے کیونکہ عمر بھر عجم اور صنادید عجم کی پرستاری میں مصروف رہ کر آخری ایام میں فردوسی کے لیے زندگی کا ایک نیا ورق انبیاء کرام کی خدمت گزاری کے لیے اُلٹنا تمام واقعات اور حالات پر نظر رکھتے ہوئے مستبعد ضرور معلوم ہوتا ہے۔ بقولِ شاعر ؎
عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے
لیکن ذیل کے اشعار ہیں جو زیادہ تر ہم کو محو حیرت و استعجاب کرتے ہیں ؎
نگارم کنوں تخم رنج و گناہ ... کہ آمد سپیدی بجائے سیاہ
(زلیخا صـ۱۴)

دیگر

زمن دستِ گیتی بدزدید مشک — بجایش پراگندہ کافور خشک
برآمد زناگاہ بازِ سفید — گسستن زاغانم ازجاں اُمید
زمانے ہمی گشت زاغ از باغ — سرانجام بنشست برجائے زاغ
نہ بنشستنی کش پریدن بود — نہ پیوستنے کش بریدن بود

(زلیخا صت ۱۴)

دیگر

پر از خاکِ شمشاد بود از نخست — کنوں برکراں سوسن تازہ رست

(زلیخا صت ۱۴)

ان اشعار کا خلاصہ اسی قدر ہے کہ ہمارا شاعر بوڑھا ہوگیا ہے اور اس کے بال سفید ہوگئے۔ شاعر کے طرزِ بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عمر میں یہ انقلاب یعنی پیری کی آمد اور بالوں کا سفید ہونا ایک تازہ واقعہ ہے جو مصرع 'کنوں برکراں سوسن تازہ رست' سے صاف ظاہر ہے۔

ہم شاہ نامہ میں بھی فردوسی کو بعض اوقات اپنی پیری کی شکایت میں مصروف دیکھتے ہیں مثلاً ذیل کے اشعار ؎

من از شصت وشش سست گشتم چو مست — بجائے عنانم عصا شد بدست
رخ لالہ گوں گشت برسان کاہ — چو کافور شد رنگ ریشِ سیاہ
ز پیری خم آورد بالائے راست — ہم از نرگساں روشنائی بکاست

(جلد دوم صت ۲۴۴)

دیگر

دو گوش و دو پائے من آہو گرفت | تہیدستی و سال نیرو گرفت
(جلد سوم ص۴۵)

دیگر

دوتائے شد آں سروِ نازاں بباغ | ہمان تیرہ گشت آں فروزاں چراغ
پُر از برف شد کوہسار سیاہ | ہمی لشکر از شاہ بیند گناہ
(جلد سوم ص۴۷)

دیگر

چو شصت و سہ سالم شدہ گوش کر | زگیتی چرا جویم آئین و فر
(جلد سوم ص۱۰۳)

دیگر

مرا دیدۂ خوش آب سستی گرفت | ہمان سروِ آزاد پستی گرفت
خروشان شد این نرگسانِ دژم | ہمی گردد از سستی و رنج نم
چل وہشت بُد عہدِ نوشیروان | تو بر شصت رفتی نمانی جوان

(خاتمۂ جلد سوم صفحہ ۱۴۵ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

ان متفرق اشعار سے جو اوپر منقول ہیں اور شاعر نے اپنے ساٹھ اور چھیاسٹھ سال کی عمر کے درمیان میں لکھے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا شاعر شاہ نامہ کے دورانِ تصنیف ہی میں بالکل ضعیف اور بوڑھا ہو چکا تھا نہ صرف اس کے بال سفید ہو چکے ہیں جو منازل پیری میں اولین منزل ہے بلکہ بصارت بالکل ضعیف ہو چکی ہے، پیری سے قد خم ہو گیا اور کمر جھک گئی۔ دست و پا میں رعشہ نمودار ہے اور عصا کی مساعدت کے بغیر نقل و

حرکت دشوار ہی، دانت گر چکے اور کانوں سے اپنی عمر کے تریسٹھویں سال ہی سے بہرا ہو گیا ہی۔ جب شاہ نامہ ختم ہو چکا ہی وہ قریباً اسی سال کا ہو چکا تھا مصرع (کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد) وہ خود معترف ہی۔

اگر مثنوی زلیخا فردوسی نے لکھی ہی تو ظاہر ہی کہ اس عمر کے بعد لکھی ہوگی اور شاہ نامہ کے بعد لکھے جانے کا خود اس تصنیف کو اعتراف ہی اگر یہ صورت ہی تو یوسف زلیخا میں اس اسی بیاسی سال کے بوڑھے کو استیلائے پیری سے جو شکایت ہی تو اسی قدر ہی کہ مصرع "کہ آمد پپیدی بجائے سیاہ" پیری کی اس قسم کی شکایت پچاس پچپن سالہ بوڑھے کی زبان پر بھلی معلوم ہوتی ہی نہ اسی پچاسی برس کے پیر فرتوت کے منہ پر۔ تعجب ہی کہ یہ پیر ضعیف یوسف زلیخا میں پیری کی موجودگی سے اپنے میں یہی انقلاب دیکھتا ہی کہ اس کے بال سفید ہو گئے اِسی مطلب کو شاعرانہ پیرایہ میں ادا کیا تو کہا کہ مشک کافور بن گیا اور جدت دکھانا چاہی تو کہا کہ سیاہ زاغ کی بجائے سفید باز نمودار ہو گیا اِس کے علاوہ وہ اور کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

اِس موقع پر اصول تنقید ہم سے کہتے ہیں کہ یہ الفاظ فردوسی کے نہیں ہیں بلکہ کسی اجنبی کے جو فردوسی سے بالکل مختلف ہی اور جسے ہم نے غلطی سے فردوسی سمجھ لیا ہی۔ ان کی عمروں کا فرق اور شاہنامہ کی داستانوں سے متعلق ان کے متناقض نظریے (جن میں ایک انھیں راست کہتا ہی۔ دوسرا دروغ پاک) اسی عقیدہ کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔

شہادتِ کلام یہ اوپر دکھایا جا چکا ہی کہ واقعاتی شہادت کی رو سے کتاب یوسف زلیخا فردوسی کی تسلیم نہیں کی جا سکتی

یہاں اسی مقصد کے لیے کسی اور پہلو سے بحث کی جاتی ہے۔ اس سے ہمارا مقصد شہادتِ کلام ہے۔ شہادتِ کلام ہمارے پاس ایک ایسا زبردست آلہ ہے جس کی رہنمائی میں ہم ایک یقینی اور قطعی فیصلہ کرنے کے قابل ہیں۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ امتدادِ زمانہ اور انقضائے ایام کے ساتھ ساتھ ہر زبان میں تغیرات واقع ہوتے ہیں۔ سیاسی انقلاب جس طرح قوموں کی مستقبل کی تاریخ بدل دیتے ہیں اسی طرح زبان کا مستقبل بھی ان تغیرات سے محفوظ نہیں رہتا۔ ہر وقت اور ہر عصر کی زبان میں مختلف نوعیت کی خصوصیت مشاہدہ کی جاتی ہے جو اس کو دوسرے ازمنہ کی زبان سے ممیز کرتی ہے۔ جوں جوں ایک قوم تمدن اور معشرت کے مدارج میں ارتقا حاصل کرتی ہے اس کو نئی ضروریات قدم قدم پر لاحق ہوتی ہیں، نئی ضروریات، نئے الفاظ اور نئی اصطلاحات ایجاد کرتی ہیں اور جس طرح ہم پرانا لباس بدن سے اتار کر پھینک دیتے ہیں اسی طرح مندرس اور پارینہ الفاظ ایک فرسودہ سکہ کی طرح ٹکسال سے خارج کر دیے جاتے ہیں۔ زبان کی نبض شناسی کے لیے لازم ہے کہ ہم اس کے تدریجی تغیر و تبدل کی تاریخ اور الفاظ کی حقائقِ زیست و ممات سے بالکلیہ واقف ہوں۔

ایک اور اصول ہے جس کا علم ہر محقق کے لیے ضروری ہے، انسان جس طرح شکل، صورت، رنگ دلون، اخلاق و طبائع اور مذاق میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اسی طرح اظہارِ خیالات اور ادائے مطالب میں ایک دوسرے سے منفرد ہیں تمثیلاً اگر ایک عہد کے دو انشا پرداز لیے جائیں جو ایک ہی مضمون پر طبع آزمائی کر رہے ہیں تو ہم دیکھیں گے کہ ان میں ادائے مضمون، انتخاب الفاظ اور اسلوبِ کلام میں نمایاں

تفاوت ہوگا باوجود اس اختلاف کے دونوں معاصروں کی تحریر میں ایک مماثلتِ قریبہ بھی مشاہدہ کی جائے گی جو بوجہ معاصرت دونوں میں عام ہے کیونکہ ہر چیز پر خواہ وہ مصنوعاتِ دماغی سے تعلق رکھے یا مصنوعاتِ دستی سے زمانہ اپنا داغ ضرور چھوڑتا ہے اور وہ خاتم جس کو ایام نے کسی چیز پر ثبت کیا ہے اس کے نقوشِ نگیں کو کوئی ہاتھ نہیں مٹا سکتا۔ اس خصوصیت کو اسالیبِ ایامی کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔

علیٰ ہذا بعض خصوصیات اس قسم کی ہیں جو کسی خطۂ ملک میں رائج ہیں اگر مصنف اِسی حصۂ ملک کا باشندہ ہے تو یہ مقامی خصوصیت اس کے کلام میں بھی پائی جائے گی مثلاً ہم شاہ نامہ میں دیکھتے ہیں کہ فردوسی نان بائی کو نانوا، ساربان کو ساروان اور برزیگر کو ورزیگر اور پیش باز کو پیش واز لکھتا ہے۔ اِس سے ہم یہ قیاس مرتب کرنے میں حق بجانب معلوم ہوتے ہیں کہ فردوسی اور اس کے ہم وطنوں میں یہ الفاظ بائے ابجد کو واو ہوز سے بدل کر تلفظ کیے جاتے تھے اس خصوصیت کا نام اسالیبِ مقامی رکھا جا سکتا ہے۔

ہمیں یہ بھی یاد رہے کہ ہر مصنف خواہ وہ کسی پایہ کا کیوں نہ ہو الفاظ کا ایک خاص ذخیرہ رکھتا ہے جس کے ذریعے سے وہ اپنے مطالب ادا کرتا ہے۔ اس ذخیرے میں بعض الفاظ، تراکیب، محاورات، کنایات، تشبیہات، صفات اور استعارات اس قسم کے ہوں گے جو مصنف کے نزدیک زیادہ مقبول اور مطبوع ہوں گے۔ اس بنا بر ان کا استعمال بالارادہ یا بلا ارادہ تحریر میں زیادہ کرے گا کیوں کہ وہ اس کے روزمرہ میں داخل ہو چکے ہیں اور یہ سرمایہ اس کی تحریر کا اسلوبِ خصوصی ہے۔

جس طرح ایک مصوّر کسی شخص کی تصویر میں اس کی ظاہری شکل وصورت اور خط وخال رنگوں کے ذریعے سے دکھا سکتا ہے اسی طرح ایک نقاد کسی مصنف کی ان تمام خصائص کی جو اُس کی تصنیف کے مخصوص خط وخال ہیں سُراغ رسانی کر سکتا ہے اور اس سے ہم کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ کسی شاعر کا قول ہے ؎

ہر کجا اُفتادہ بینی خشت در ویرانۂ
ہست فردِ دفترِ احوال صاحب خانۂ

جب صاحبِ بصیرت کے نزدیک ایک خشت دفترِ احوال کی ایک فردِ ہے تو ایک کتاب جو مصنف کے دل ودماغ کا عکس خیالات، معلومات اور مقولات کا آئینہ ہے اور جس میں اس نے اپنی شخصیت کی تمثال کو الفاظ کے جامہ میں یادگار چھوڑا ہے نظر امعان میں اس صاحبِ تصنیف کی ہستی کو مشخّص اور اس کے وجود کو دوسرے افراد سے جداگانہ شخصیت تسلیم کروانے کے لیے کیا قابل اعتبار شہادت نہیں بن سکتی جس کا ہر ہر لفظ اور ہر ہر فقرہ حقیقت میں بجائے خود ایک تاریخ ہے۔

جب ایک ماہرِ آثارِ قدیمہ کسی شکستہ وریختہ عمارت پر نظر ڈال کر اس کی عمومی وضع، محرابوں کی ہیئت، گنبدوں کی ساخت، ستونوں کی نقاشی ونقّاری چھت اور دیواروں کی گلکاری اور نقش ونگار سے اس کی تعمیر کا صحیح زمانہ قائم کر سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایک محقق کسی کتاب کے مقالات کنایات اور محاورات کو دیکھ کر اس کے عہدِ تصنیف کا سراغ نہ لگا سکے۔

قصہ مختصر شہادتِ کلام سے استفادہ کی خاطر ہم کو اس نظر سے یوسف زلیخا کا مطالعہ کرنا ہوگا جس کا مختصر سا خاکہ اوپر درج ہے۔ سب سے

مقدم زلیخا کے مخصوص خط و خال دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور
حتی الامکان شاہ نامہ سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔

اس مضمون کے دوران میں یوسف زلیخا اور شاہ نامہ کے جن نسخوں
سے میں نے کام لیا ہے وہ ذیل کے مطابع سے تعلق رکھتے ہیں:-

(۱) یوسف زلیخائے حکیم فردوسی مصوّر۔ طبع ایران۔ دار الطباعہ خاصۂ
مدرسۂ مبارکہ دار الفنون طہران سنہ ۱۲۹۹ھ

(۲) شاہ نامۂ فردوسی۔ طبع میرزا محمد باقر۔ بمبئی، سنہ ۱۲۷۵ ہجری

اسالیب خصوصی

گوش داشتن۔ بمعنی گوش کردن و متوجہ شدن
و کنایہ از نگہ داشت و حفاظت۔ شاہ نامہ میں
پہلے معنوں میں عام طور پر رائج ہے۔

ذیل میں چند امثال مرقوم ہیں۔ شاہ نامہ:-

بگشتاسپ گفت ای پسر گوش دار (۱) کہ تندی نہ خوب آید از شہریار (جلد دوم ص ۲۷۹)

کہ ای مادرِ مہرباں گوش دار (۲) کہ ما بے گناہیم زیں کارزار (جلد چہارم ص ۲۳)

بدیں گفت من گوش دارید پاک (۳) روانرا مخواہید جائے مغاک (جلد سوم ص ۶)

باندرزِ من سر بسر گوش دار (۴) پذیرندہ باش و بدل ہوش دار (جلد سوم ص ۵۸)

ان امثال میں نگہ داشت کے معنی دیتا ہے۔

سلاحِ سوارانِ جنگی بپوش (۵) بجان و تنِ خویشتن دار گوش (جلد اول ص ۱۵۶)

بشد بابنۂ اشکشِ تیز ہوش (۶) کہ دارد سپہ را بہرِ جائے گوش (جلد دوم ص ۲۱۷)

لیکن اس شعر میں منتظر رہنے کے معنوں میں آیا ہے:-

نباید کہ جوید کسے جنگ و جوش (۷) برہام گودرز دارید گوش (جلد دوم ص ۲۵۰)

گزشتہ دو امثال کے سوا گوش داشتن شاہ نامہ میں حفاظت کے معنی

نہیں دیتا۔ زلیخا میں وہ کنایہ بن کر عام طور پر حفاظت اور نگہداشت کے معنی دیتا ہے۔ زلیخا۔ امثال ؎

نباید ورا چوں شما گوش دار (۱) کہ خود گوش دار د ورا کردگار (صد ۱۲)

کہ اورا بجاں گوش داریم پاک (۲) بجان و دل و دیدہ داریم پاک (صد ۲۹)

گرایزد بدیں تو بہ یاری کند (۳) ترا ؤ مرا گوش داری کند (صد ۴۷)

من ایں پیرہن گوش دارم کنوں (۴) نشویم زہ ہرگز ایں تیرہ خوں (صد ۴۶)

نظامی ؎ بزرگاں درآں حال دارند گوش وگرنہ دل پا بدارد نہ گوش

(سکندر نامۂ بحری صد ۵۵ مطبع نول کشور)

سعدی ؎ ہمہ سنگہا گوش دار ای پسر کہ لعل از میانش نباشد بدر

(صد ۱۶۰ بوستان مطبع رفاہ عام)

مرزبان نامہ: "گفت ای ہمہ ایں جا کہ نشستہ، گوش بخود دار و متیقظ باش کہ اینجا کمیں گاہ یغمائیان قضاست" (صد ۱۱۱ مطبوعہ بریل ۱۹۰۹ء)

اس مطالعہ سے ہم کو اس قدر علم ہوا۔ کہ فردوسی جب کہ اس کنایہ کا عادی نہیں ہے صاحب زلیخا کے ہاں وہ روزمرہ بن کر بالعموم مستعمل ہے۔ گوش داشتن کوئی ایسا کنایہ معلوم نہیں ہوتا جو اساتذہ کے ہاں مقبول ہو۔ سنائی کے ہاں جب کہ حدیقہ میں مطلق غیر حاضر ہے نظامی اور سعدی کے ہاں صرف ایک ایک مثال میں ملتا ہے۔

گرہ برزدن یہ محاورہ شاہ نامہ میں اس کے لغوی معنوں میں ملتا ہے شعر

دو دست از پسِ پشت بستش چو سنگ گرہ زد بگردنش بر پالہنگ (جلد سوم صد ۱۸)

اسدی ؎ برآہیخت خرطوم پیل از زرہ به پیچیده چوں رشتہ برزد گرہ
(صـ۳۳ گرشاسپ نامہ، طبع آقا محمد شیرازی ۱۳۰۶ھ)

یوسف زلیخا میں وہ کنایہ بن کر خاموش ہونے کے معنی دیتا ہے۔ امثال
از زلیخا ؎

ازاں تخم کشتن پشیماں شدم (۱) زباں را و دل را گرہ برزدم (صـ۱۴)
چو شمعوں به پرداخت ایں داستاں (۲) زباں را گرہ زد ہم اندر زماں (صـ۱۶۵)
ولیکن تو گفتی بہ عمداً کسے (۳) ہمی بر زبانم گرہ زد بسے (صـ۱۴۴)

گمان زدن ۔ بمعنی گمان کردن یہ زلیخا کی شان خصوصیت ہے کہ اس میں گمان زدن ملتا ہے۔ فردوسی شاہ نامہ میں اس سے ناواقف ہے۔ امثال
از زلیخا ؎

توگفتی ہمی زد دلش را گمان (۱) کہ آید بلا ہا زمان تا زمان (صـ۳۸)
گماں زد دلم ای شہ کامیاب (۲) کہ بنویسی آں نامہ ام را جواب (صـ۱۹۷)
گہش دل بداں ساں ہمی زد گماں (۳) کہ وے را بکشتند جائے نہاں (صـ۶۹)
گماں زد دلِ پاک وے کیں پسر (۴) ز نیکانِ شایستہ دارد گہر (صـ۹۵)

فردوسی ایسے موقعوں پر گماں کردن اور گماں بردن لاتا ہے جو زلیخا میں بھی آتے ہیں ۔

دل برگماردن ۔ شاہ نامہ میں غیر مستعمل ہے اور زلیخا سے امثالِ ذیل ؎

ایا مادرِ مہربان زینہار (۱) یکے گوش و دل را بمن برگمار (صـ۸۳)
کنوں گوش برحالِ یعقوب دار (۲) زمانے دل و ہوش دل برگمار (صـ۶۳)
بدو گفت کائے پر ہنر شہریار (۳) دمے دل بریں داستان برگمار (صـ۱۵۴)

ایا ای پدر دل بریں بر گمار (۴) تامل کن اندر نہان و آشکار (ص ۱۹۱)

فردوسی ایسے موقعوں پر نگہ کن۔ بژرفی نگہ کن۔ گوش دار یا بہن بکشائے گوش لاتا ہے۔

آئین بستن۔ زلیخا میں رائج ہے۔ امثال ؎

بہ بستند آئینِ بازارہا (۱) ہمہ شہر شد ہم چو گلزار ہا (ص ۲۱۰)

چو آئین ہا بستہ شد در سرائے (۲) نگم بد سرا از بہشتِ خدائے (ص ۲۲۲)

شاہ نامہ میں اس کے بجائے آذین بستن کا رواج زیادہ دیکھا جاتا ہے۔

شاہ نامہ ؎

چو نزدیک شہر اندر آمد سپاہ (۱) بہ بستند آذین بہ بیراہ و راہ (جلد دوم ص ۲۶۳)

بہ بستند آذین بہ شہر و براہ (۲) ہمہ برزن و کوے و بازارگاہ (جلد دوم ص ۲۶۶)

بہ بستند آذین بہ شہر اندرون (۳) پُر از خندہ لبہا و دل پر زخوں (جلد سوم ص ۶۱)

بہ بستند آذین بہ شہر و براہ (۴) کہ شاہ آمد از دشت نخچیر گاہ (جلد چہارم ص ۱۰۲)

بہ بستند آذین بہ شہر و براہ (۵) درم ریختند از بر دخت شاہ (جلد چہارم ص ۲۳)

گرمی نمودن۔ گرم جوشی کا اظہار کرنا۔ شاہ نامہ سے یہ محاورہ مفقود ہے۔ امثال از زلیخا ؎

بشد مرد بسیار گرمی نمود (۱) بجا آورید آنچہ فرمودہ بود (ص ۱۶۱)

ہزاران لُطف کرد و گرمی نمود (۲) ابر مہر دوشیں فراواں فزود (ص ۲۶)

فراوان بہ پرسید و گرمی نمود (۳) دلش را بدو مہربانی فزود (ص ۲۱۸)

صورت بستن شاہ نامہ میں نہیں ملتا۔ زلیخا سے یہ امثال ؎

خریدنش را بست صورت عزیز (۱) بہ چنداں کہ بودش ز ہر نوع چیز (ص ۹۴)

مکن ای پدر صورت بد بہ بند (۲) زما بر برادر نیاید گزند (ص ۱۰۱)

کہ صورت همی بندم اندر میان (۳) کہ ہست آن دلارام من در جہان (ص ۱۹۸)

قابوس نامہ :۔ "ولیکن من چندان کہ صورت بندد بگویم و سامان ہر یک بتو نمایم"

(باب سی ویکم در طالب علمی و فقیہی ص ۱۴۲ طبع ایران)

مرزبان نامہ :۔ "و بوقت گزشتن ازین منزل انقطاع و جدائی او صورت نہ بندد"

(باب سوم داستان ملک اردشیر و دانائے مہران بہ ص ۷۲)

تخت زدن زلیخا میں عموماً مستعمل ہے اور تمام شاہ نامہ میں صرف ایک مقام پر ملتا ہے امثال از زلیخا ؎

میان جائے میدان زدہ تخت زر (۱) عزیز از سرِ تخت با تاج زر (ص ۹۲)

زدندے یکے تخت زرّین بدان (۲) نشستی بر آن یوسفِ کامران (ص ۱۶۰)

یکے تختِ زرّین میانش زدہ (۳) سرِ پائے آن تخت برمہ زدہ (ص ۱۶۸)

زدہ تخت زرّین گوہر فگند (۴) قد مہاش چون قدرِ شاہان بلند (ص ۱۷۴)

شاہ نامہ ؎ میانِ سرا پردہ تختے زدہ ستادہ غلامان بہ پیشیں رده

(جلد اول ص ۹۴)

اسدی ؎ یکے تخت پیروزہ ہمرنگ نیل زدہ پیش تخت ایستادہ دو پیل

(گرشاسپ نامہ ص ۳۰ طبع آقا محمد شیرازی ۱۳۰۷ھ)

کِلّہ زدن باثانی مشدّد سقف و پردہ زدن شاہ نامہ میں نہیں ملتا اور زلیخا میں ملتا ہے۔ مثال از زلیخا ؎

زدہ کِلّہ و تاجِ گوہر نگار (۱) بر آئین در آویختہ شاہوار (ص ۱۷۶)

زدہ کِلّہ بالائے شاہانہ تخت (۲) نشستہ بر و یوسفِ نیک بخت (ص ۲۲۲)

اگرچہ شاہ نامہ اس محاورے سے نابلد ہے اسدی کے ہاں ملتا ہے چنانچہ ؎

رسیدند زی آبگیرے فراز (۱) زدہ کِلّہ زربفت از وے فراز (گرشاسپ نامہ ص ۱۴)

زدہ کِلّہ برگشتہ کرگس زابر (۲) طمع کردہ رو بر بخونِ ہژبر (ص ۶۴)

مسعود سعد سلمان ؎

بدرّ و گوہر آراستہ پدید آمد چو نوعروسے در کِلّہ از میان حجاب

حکیم سنائی غزنوی ؎

دستِ انصاف تا تو بکشادی این جہاں بست کِلّۂ شادی

(حدیقہ سنائی ص ۱۹۷ مطبع نول کشور)

عتاب برداشتن شاہ نامہ سے غیر حاضر ہے۔ زلیخا سے یہ امثال ؎

چنیں گفت یوسف علیہ السلام (۱) کہ برداشتیم آں عتاب و کلام (ص ۲۰۲)

شنیدم کہ یوسف بک خواستخوان (۲) چو برداشت او آں عتاب از میان (ص ۲۰۳)

غریویدن لُغات میں شور و غوغا نیز فریاد کے معنوں میں مستعمل ہے

زلیخا میں مطلق رونے کے معنوں میں آتا ہے۔ امثال از زلیخا ؎

بمہرِ دلش تنگ در بر گرفت (۱) وزان پس غریویدن اندر گرفت (ص ۵۰)

زمانے غریوید و بارید خون (۲) بر آں چہرۂ چین دینار گون (ص ۲۱۸)

پس آمد غریوان بہ بنگاہ باز (۳) دلش بے شکیب و تنش در گداز (ص ۵۲)

غریویدنِ آن فروزاں چراغ (۴) ہمی کرد یعقوب را دل بداغ (ص ۳۷)

فراوان غریوید و نالید زار (۵) ازاں خواب واژونۂ نابکار (ص ۴۳)

غریویدن و زاری اندر گرفت (۶) زہر گونۂ نوحہا بر گرفت (ص ۵۸)

غریوید یوسف دگر بارہ زار (۷) بغلطید بر خاک رہ زار و خوار (ص ۵۹)

یاد رہے کہ صاحب یوسف زلیخا اِس لفظ کا بہت شائق معلوم

ہوتا ہی اور اسی لیے اس کا استعمال کثرت کے ساتھ کرتا ہی۔ شاہ نامہ میں وہ اوّل تو قلّت کے ساتھ ملتا ہی اور اگر ملتا ہی تو محض شور للکار یا فریاد کے معنی دیتا ہی۔ امثال شاہ نامہ سے

غریویدنِ مرد و غرّندہ کوس (۱) ہمی کرد بر رعد غرّان فسوس (صـ۶۰ جلد اول)
غریویدن آمد ز توران سپاہ (۲) ز سر برگرفتند گردان کلاہ (صـ۲۲۷ جلد دوم)
وزان پس ز ہم روے برکاشتند (۳) غریویدن و بانگ برداشتند (صـ۲۳۶ ")
یک دختبان گوشہا برگرفت (۴) غریوان از د ماند اندر شگفت (صـ۶ جلد اول)

افعالِ متعدّی بیک مفعول

زلیخا کی ایک خصوصیت یہ ہی کہ اس میں بعض افعال جو عموماً متعدّی بیک مفعول لائے جاتے ہیں متعدّی بدو مفعول باندھے گئے ہیں۔ بعض تمثیلیں یہاں درج ہیں۔

پوشیدن بمعنی پوشانیدن۔ زلیخا سے امثال سے

بہ پوشید آن جامہ فرزند را (۱) بشانہ زد آن موے دلبند را (صـ۵۱)
در و جامہ پوشید دیباے روم (۲) کہ چون نقش مانی بُدش نقشِ بوم (صـ۸۰)

لیکن شاہ نامہ میں تن ڈھانکنے کے معنوں میں صرف ایک مقام پر ملتا ہی سے
تنش را یکے پہلوانی قباے بہ پوشید وانہ کوہ بگزارد پاے (صـ۲۹ جلد اول)

پرہیزیدن بجائے پرہیزانیدن۔ زلیخا امثال سے

کہ این بندہ را اندرین قعر چاہ (۱) بہ پرہیزد از آب دارش نگاہ (صـ۶۲)
مکن یاوہ نام و نشانِ مرا (۲) بہ پرہیز جان و روانِ مرا (صـ۱۱۵)
بہ پرہیز از اہرمن بیر ہم (۳) ہمی دار دست از بدی کوتہم (صـ۲۲۴)

شاہ نامہ میں یہ صورت نا معلوم ہی۔

شنیدن بجائے شنوانیدن۔ زلیخا ؎

بہ شک بود یعقوب فرخ سیر (۱) سرانجام پرسید زاں پرہنر
کہ یوسف چو بشنید پیغامِ خویش نشانیت بنمود زاندام خویش (ص۱۰۶)

شاہ نامہ میں یہ صورت نہیں ملتی۔

اسالیب مقامی

خرید و فروش بجائے خرید و فروخت۔
زلیخا۔ شعر

بدینسان خرید و فروش اوفتاد ستد یوسف وآن دِرِ مہا بداد (ص۷۶)

فردوسی خرید و فروخت لاتا ہے۔ شاہ نامہ ؎

ہمی بود چندے خرید و فروخت (۱) بیابان زلشکر ہمی برفروخت (ص۲۲ جلد سوم)
پُراز خورد و داد و خرید و فروخت (۲) توگفتی زمان چشم ایشان بدوخت (ص۶۲ جلد دوم)

قابوس نامہ :۔ "بندہ کہ بہر کارے فروخت خواہد و از خرید و فروخت۔
خویش عیب نہ دارد دل بروے منہ کہ از وے فلاح نیاید"۔

(باب بست و سیم در بندہ خریدن ص۱۰۹)

سعدی ؎ بریدند ازاں جا خرید و فروخت زراعت نیامد رعیّت بسوخت

(بوستان ص۷ مطبع رفاہِ عام)

پرس، بجائے پرسش۔ زلیخا ؎

چو یعقوب فرخ بہ پرس و درود ابا ابن یامین سخن گفتہ بود (ص۲۰۹)

طلحہ مروزی ؎ چوں صبر رمیدہ شد پیامِ تو چہ سود جان رفت زپرسش و سلام تو چہ سود

شاہ نامہ میں پرسش اگرچہ رائج ہے لیکن موجودہ صورت قطعی غیر حاضر ہے۔

بند و کشاے بجائے بند و کشاد، یا بست و کشاد۔ شاہ نامہ میں ان تینوں
صورتوں میں سے ایک بھی نہیں ملی۔ پہلی صورت زلیخا میں ملتی ہے۔ امثال ؎

زسختی و سُستی و بند و کشاے (۱) کہ دیدند پیغمبرانِ خداے (ص۱۵)
تن و جان سپردم بحکم خداے (۲) بہ سخت و بہ سست و بہ بند و کشاے (ص۴۷)
چنیں تا بہ تقدیرِ حکمِ خداے (۳) کہ بے حکم او نیست بند و کشاے (ص۲۲۲)

بند و کشاد کی مثال میں انوری کا شعر دیا جاتا ہے۔

زمانہ ملکے کز مہرِ خاتمش در ملک — ہزار بند و کشاد و ہزار برگ و نو است

مثال بست و کشاد۔ مرزبان نامہ "کاہلی و خامی را خورسندی مخوان کہ نقش عالم حدوث در کارگاہ جبر و قدر چنیں بستہ اند کہ تا تو در بست و کشاد کارہا میانِ جہد نہ بندی ترا ہیچ کار نہ کشاید۔"

داد خواہ بمعنی داد پسند اے خداۓ تعالیٰ۔ ان معنوں میں شاہ نامہ میں نہیں ملتا زلیخا سے امثالِ ذیل ؎

من اول خطا کردم ای داد خواہ (۱) مقرم بداں کار زشت و گناہ (ص۲۱۶)
بداں پایگاہ و بدیں دست گاہ (۲) سپردی بمن بازش ای داد خواہ "
ہمی ترسم از داورِ داد خواہ (۳) کہ ہرگز نیامرزدم زیں گناہ (ص۱۲۶)

شاہ نامہ میں فریادی کے معنی دیتا ہے۔ امثال ؎

ہمی راہ جوید بنزدیک شاہ (۱) ز راہِ دراز آمدہ داد خواہ (ص۲۰۵ جلد دوم)
زخویشان کاموس چندیں سپاہ (۲) بہ نزدیک خاقان شدہ داد خواہ (ص۱۸۹)

خوار بار لغات میں (برہان قاطع) اِس کے معنی خوراک اندک دیے ہیں شاہ نامہ میں اس لفظ کی تلاش بے سود ثابت ہوئی اس سے ظاہر ہے کہ فردوسی اس سے ناواقف تھا۔ عطا بن یعقوب الکاتب جو قرنِ پنجم کے منتصفِ دوم کا شاعر اور سلطان ابراہیم غزنوی کا مادح ہے لکھتا ہے:۔

آن کہ نامش خوار بار و زیر بارش خلق خوار　　خورد چون دندان مار و کردہ شہرے چوں سلیم

(لباب الالباب محمد عوفی - باب ششم صـ۵۰ - طبع بریل)

بُرہان الاسلام تاج الدین عمر بن مسعود مقتول ۶۰۵ھ ہجری ؎

من خود عزیز بار نیم خوار بار گیر　　آخر نہ گاؤ بہ بود از خوار بار دور

(لباب، باب ہفتم صـ۱۷۵ حصۂ اول)

زلیخا میں یہ لفظ روزمرہ کا حکم رکھتا ہے۔ امثال از زلیخا ؎

دہم خوار بار و کنم نیکوئی　(۱)　نہ گردم بہ گردِ درِ بد خوئی　(صـ۱۹۹)

دہم تاں ازیں بیشتر خوار بار　(۲)　گلِ سرخ تان بشگفانم زنار　(صـ۱۶۶)

زکنعان کشیدیم تختے جہاز　(۳)　کزیں خوار بارست مارا نیاز　(صـ۱۶۱)

یکے دانہ تان ندہم از خوار بار　(۴)　کنم تان بروں از در مصر خوار　(صـ۱۶۹)

خبر یافتیم از تو اے شہریار　(۵)　کہ داری بمصر اندرون خوار بار　(صـ۱۶۴)

اسالیبِ ایّامی ملکت بمعنی مملکت فی زماننا متروک ہے۔ شاہ نامہ میں غیر رائج ہے۔ اس لیے قیاس یہی چاہتا ہے کہ سلجوقی دور میں اس کا رواج پھیلا۔ اِس عہد کے شعرا منوچہری، معزی، عثمان مختاری حکیم سنائی اور عمعق بخاری وغیرہ وغیرہ کے ہاں ملتا ہے۔ بعض امثال حوالۂ قلم ہیں ؎

منوچہری ؎ آفتابِ ملکتِ سلطان کہ دستِ جود او　　خواہد او را کز میانِ خلق بے ہمتا کند

امیر معزی　مصرع　　مؤیدے کہ مؤید بدوست ملکت شاہ

حکیم سنائی ؎ شاہِ عادل، نکو نیت دستور　　ملکت آباد دست ظالم دور

(حدیقہ صـ۱۰۰ طبع نول کشور)

حدیقہ میں یہ لفظ کثرت سے ملتا ہے۔ استاد عمعق بخاری ؎

"کنوں شد ایں مثل ای پادشا مرا معلوم | بامتے کہ ہلاک ست و ملکتے کہ ہباست"

(لباب - حصّہ دوم - باب دہم ص۱۸۵)

مثنوی یوسف زلیخا سے یہ مثال پیش ہی ؎

گرفتم دل از ملکتِ کیقباد | ہماں تخت کاؤس کے بر دباد

(مقدمہ زلیخا ص۱۴)

غریو و غرنگ یا بالعکس بمعنی گریہ و زاری۔ شاہ نامہ میں اس کا سراغ نہیں چلتا ؎

اسدی به گفت ایں و شد باغریو و غرنگ | به لالہ زلولو ہمی شست رنگ

(ملحقات شاہ نامہ ص۸ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

ازرقی موافق تو کند در صعود و ناز طرب | مخالف تو کند در عمان غریو و غرنگ

(لباب الالباب - حصہ دوم باب دہم ص۹۹)

زلیخا میں کئی مقام پر ملتا ہی - امثال از زلیخا ؎

(۱) کہ بدسال و مہ با غریو و غرنگ | نہ شد کور آدم بہ چنداں درنگ (ص۴۲)

(۲) دلِ یوسف اندر غرنگ و غریو | شتابان شتر در بیابان چو دیو (ص۸۱)

(۳) نہ در دل شکیب و نہ در چہرہ رنگ | ورا دید جفت غریو و غرنگ (ص۱۲۰)

(۴) غریو و غرنگ تو از بہر کیست | کہ ایں نالہ و زاری از بہر چیست (〃)

(۵) دلش تنگ و عالم بد و گشتہ تنگ | ہمہ روز بد با غریو و غرنگ (ص۱۱۶)

از بہر چیزے یا کسے را ایک اور صورت ہی جس سے ہم شاہ نامہ میں روشناس نہیں ہوتے اور زلیخا میں دو چار ہوتے ہیں - امثال از زلیخا ؎

(۱) تو بپذیر از و یوسف خوب را | ہمی دارش از بہر یعقوب را (ص۳۷)

(۲) من ای روشنائی ز بهر چرا   به باید همی آزمودن ترا (ص ۱۱۴)

قابوس نامہ:۔ "دو دانگ ذخیره کن از بهر روز ضرورت را و پشت بروی کن و بهر خللے از وے یاد میار"

(باب بست و یکم در جمع کردن مال ص ۹۶)

حکیم سنائی ؎ یارب ایں خربطانِ عالم را   گم کن از بهر عز آدم را
(حدیقہ ص ۱۴۹)

سنائی کے ہاں یہ محاورہ بہت مقبول ہی

عبدالواسع جبلی ؎ هر روز بامداد ز بهرِ مراهی   از مشک سوده برسمن تازه خالها
(لباب ۔ باب دہم ص ۱۰۱ حصہ دوم)

لطف بہ تحریک اوّل و ثانی بقاعدہ تفریس درست ہی چنانچہ منوچہری ع
از لطف هرچه کند باتو سزاے تو کند

اور ادیب صابر ؎

قطب فضل و فلک دولت و مجموع علوم   قبلہ همت و حلم و لطف و جود و کرم

مثال از زلیخا:۔

فراوان لطف کرد و گرمی نمود   ابر مهر دوشین فراوان فزود (ص ۲۶)

عفو بر دے تفریس بفتح اوّل و ضم ثانی ۔ یوسف زلیخا دونوں تلفظ سے واقف ہی۔ امثال از زلیخا ؎

(۱) وگر راست گوئید با من سخن   عفو تان کنم کردہاے کہن (ص ۱۴۷)
(۲) صلاحِ جهان را از و خواستی   تنِ خویشتن را عفو خواستی (ص ۱۵۲)
(۳) عفو کردمت زان گناهِ عظیم   بحاجت بخواهم ز ربِّ عظیم (ص ۲۰۷)
(۴) ایا داد فرهنگ با بیخ و بُن   عفو کن مرا زین برهنه سخن (ص ۱۱۶)

سعدی ؎ عفو کردم از وے عمل ہائے زشت　　در آرم بفضلِ خودش در بہشت

فردوسی اوّل تو شاہ نامہ میں اس لفظ کا استعمال ہی نہیں کرتا اور اگر کرتا ہی تو قاعدۂ تفریس سے نابلد ہی اور صحیح تلفظ سے لکھتا ہی ؎

شاہ نامہ ؎ بکن عفو یارب گناہِ ورا　　بیفزائے در حشر جاہِ ورا

(دیباچہ ص۳)

عمداً بسکونِ دوم۔ استاد عمعق بخاری ؎

ای صنوبر قد نہ دانی تو چگونہ فتنۂ　　یا ہمی دانی بعمداً خویشتن نادان کنی

(لباب، حصہ دوم، باب دہم ص۱۹۰)

حکیم ضیاالدین محمود الکابلی۔ شعر

بگاہِ حلم عمداً از نہیبِ ضربتِ عدلت　　بریزد زہر از مار و بیفتد نیش از کژدم

(لباب۔ حصۂ دوم باب یازدہم ص۲۱۶)

زلیخا میں ایک مقبولہ روزمرہ بن گیا ہی۔ زلیخا ؎

(۱) بعمداً ہمی تاختندش براہ　　باندک زمان پائے وے شد تباہ (ص۵۳)

(۲) بعمداً سوئے سقف کردش نگاہ　　ہمان سیم تن دید چون مہر و ماہ (ص۱۲۵)

(۳) ولیکن تو گفتی بعمداً کسے　　ہمی بر زبانم گرہ زد بسے (ص۱۴۲)

شاہ نامہ نہ صحیح اور نہ مفرس لاتا ہے

عماری زلیخا اگرچہ صحیح تلفظ سے باخبر ہی۔ حرفِ دوم کو مشدّد بھی باندھا ہی۔ امثال از زلیخا ؎

(۱) یکے کاروان ساخت چون نوبہار　　ز بس مہد و عمّاری زرنگار (ص۲۰۸)

(۲) زنان شان بعمّارے اندر ہمہ　　عماری بزرّ و بزیور ہمہ (ص۲۰۹)

(۳) کہ از مہد و عمّاری زرنگار　　شود خیرہ چشم و دل روزگار (ص۲۰۷)

شاہ نامہ میں عماری کا ذکر اگرچہ پچاسوں مقام پر آیا ہے۔ لیکن مشدد کی ایک مثال بھی دستیاب نہیں ہوئی۔ شاہ نامہ ؎

عماری پسیچیدہ و دیبا جلیل (۱) کنیزک بہ بروند چینی و خیل (ص۲۶ جلد سوم)
عماری بہ چہل جملہ از سیم و زر (۲) بدو اندرون لعبتِ سیم بر (ص۲۰۶ جلد دوم)
عماری پسیچیدہ رفتن براہ (۳) مرآن خفتہ را اندرون جایگاہ (ص۲۰۰ ،،)
عماری بماہ نو آراستہ (۴) پسِ پشت او اندرون خواستہ (جلد اوّل ص۶۰)
عماری پسیچید و آمد براہ (۵) نشستہ بدو اندرون جفت شاہ (ص۱۳۲ جلد سوم)

زلیخا کے دوران میں عماری کا نیا تلفّظ فردوسی کے لیے سیکھنا قابل استعجاب ہے۔

مشاطہ بلا تشدید دوم۔ شاہ نامہ میں فردوسی اس لفظ سے واقف نہیں۔ امثال از زلیخا ؎

(۱) زیعقوب و زہرکس اندر نہفت مشاطہ بلیبا فرستاد و گفت (ص۲۵)
(۲) مشاطہ شد آراست آں ماہ را ہمان مہربان دختِ دل خواہ را (،،)

اسدی ؎ ہمیدون تموز و دیش چاکر ست بہارش مشاطہ خزان زرگر ست
(ص۶ گرشاسپ نامہ)

مسعود سعد سلمان ؎
مگر مشاطۂ بستان شدہ است باد و سحاب کہ ایں بہ بستش پیرایہ وان گشاد نقاب

حکیم سنائی ؎ خرد آمد مشاطۂ جانت خرد آمد چراغِ ایمانت (حدیقہ ص۳۴۶)

یشوم بمعنی شوم، مشئوم کی بگڑی شکل ہے، شاہ نامہ میں نامعلوم ہے
اور زلیخا سے امثال ذیل ؎

(۱) ازان روز یشوم کان بدخبر — شنیدم بگوشِ دل و ہوش سر (ص ۱۰۳)
(۲) ازان روز یشوم و تاریک و بد — کہ مہجور شد یوسفِ باخرد (")

قابوس نامہ "و باشد کہ نہ چنیں بود ولیکن یشوم بود و صاحب کش بود"
(باب بست و پنجم در چہار پائے خریدن ص ۱۱۳ طبع ایران)
سنائی غزنوی ؎ کان کہ گوید منم شدہ معصوم — اوست بر نفسِ خویشتن یشوم
(حدیقہ ص ۴۳۲ نول کشور)

نکوئی بمعنی حسن و جمال، ان معنوں میں شاہ نامہ میں یہ لفظ غیر مستعمل ہے
اور زلیخا میں بالعموم ملتا ہے۔ امثال۔ زلیخا ؎

(۱) ترا ہست چنداں جمال و کمال — نکوئی و کشّی و غنج و دلال (ص ۱۱۶)
(۲) نکوئی سپاہست و شاہش توئی — زمین آسمان ست و ماہش توئی (ص ۱۱۷)
(۳) دو صد بار زان خوب تر گشتہ بود — نکوئیش زاندازہ بگزشتہ بود (ص ۹۷)
سنائی غزنوی ؎ رفت وقتے زنے نکو در راہ — شدہ از کارہائے مرد آگاہ
(حدیقہ ص ۳۷۹)

کاریگران زلیخا میں ملازمین اور چاکروں کے معنوں میں آتا ہے زلیخا ؎

(۱) ازان شادمانی ہم اندر زمان — بفرمود پنہان بہ کاریگران (ص ۱۶۷)
(۲) چو اسباط بیرون شدند از سرائے — بفرمود فرخ شہ نیک رائے
بکاریگران تا بہ بندند بار — تمامی صد اشتر ہمہ خوار بار
بکردند آں چاکران کارِ خویش — بفرمانِ شاہِ جہان دارِ خویش (ص ۱۸۱)

شاہ نامہ میں یہ لفظ معمار اور دیوارگر کے معنی دیتا ہے امثال از شاہ نامہ ؎

(۱) دگر گفت کاریگران آورید — گچ و سنگ و خشت گران آورید

(۲) چہل روز تا کار نشیندم — زکاریگران شاہ نگزیندم

(۳) بدانست کاریگر راست گوے — کہ عیب آورد مرد دانا بدوے

(۴) برفتند کاریگران سہ ہزار — زہر کشورے ہر کہ بد نام دار

(ساختن خسرو شہر مداین را ص ۱۰۷ جلد چہارم شاہ نامہ، طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

زلیخا میں اگر اس لفظ کو نئے معنوں میں استعمال کرنا فردوسی سے بعید معلوم ہوتا ہے۔

جلدی بمعنی چالاکی و زودی شاہ نامہ میں غیر رائج ہے۔ زلیخا سے یہ مثالیں پیش ہیں ؎

(۱) بجلدی زن چابک پیش دست — کیانی کمر بر میانش بہ بست (ص ۳۹)

(۲) بدانست کان بد ز حکم خدائے — نہ از روئے جلدی بد و جہد و رائے (ص ۲۰)

(۳) زجلدی دگر بارہ فریاد زد — چنین گفت کاے ناخردمند مرد (ص ۱۲۹)

حکیم سنائی غزنوی ؎ سگ اگر جلد بودی و فربہ — یک شکارے نماندے اندر دہ

(حدیقہ ص ۲۳۶)

قضارا شاہ نامہ میں اس کا رواج نہیں اگرچہ ذیل کی مثال میرے دعوے کے خلاف ہے۔ شاہ نامہ ؎

کہ ایرج بر و مہر بسیار داشت — قضارا کنیزک از و بار داشت (جلد اول ص ۲۰)

تمام شاہ نامہ میں صرف ایک نظیر ملنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فردوسی اس محاورے کا عادی تھا ممکن ہے کہ بعد کی ترمیم ہو۔ زلیخا میں البتہ یہ روزمرہ کا حکم رکھتا ہے۔ زلیخا ؎

(۱) قضارا شبے دید روشن بخواب — کہ دہ گرگ با خشم و کین و عتاب (ص ۹۳)

(۲) قضارا یکے روز یوسف پگاہ — برون شد باُمید یک لخت راہ (ص ۱۰۳)

(۳) قضارا یکے دایۂ سال خورد — بناگہ بدان سیم تن باز خورد (ص ۱۲۰)

(۴) ہمیں بود غمگین دل شہریار — قضارا فراز آمد آن آبدار (ص ۱۲۳)

اسدی طوسی ؎ قضا ہر دو بر ہم رسیدند تنگ — زدہ برکشیدند و برخاست جنگ

(ملحقات شاہ نامہ ص ۹)

سنائی غزنوی ؎ از قضارا وبائے گاوان خاست — ہر کہ را پنج بود چار بکاست

سعدی ؎ قضارا من و پیری از فاریاب — رسیدیم در خاکِ مغرب باب

ورج بفتح اوّل، قدر و قیمت و شان و شکوہ اور حد و اندازہ کے معنوں میں آتا ہے زلیخا میں کثرت کے ساتھ ملتا ہے اور شاہ نامہ میں عنقا ہے۔ زلیخا ؎

(۱) زورج تو فرزانۂ یک دلہ — ہم حجلہ شد ساختہ ہم گلہ (ص ۲۷)

(۲) ہمی گفت ہر کس کہ از ورج اوست — کہ ایں بچگان را پلنگ است پوست (ص ۲۹)

(۳) فروخفت تا از زمین چتر زر — برآمد بفیروزی و ورج و فر (ص ۱۱۱)

(۴) بخاصہ جوانی دل از بخت شاد — کہ باشد در و ورج و بخت و مراد (ص ۱۲۶)

(۵) کہ دادی مرا یوسفِ پارسا — کز و ملکِ من یافت ورج و بہا (ص ۱۵۳)

شاہ نامہ اس کے بجائے ارج لاتا ہے۔ امثال ؎

(۱) دریں جائے گُفتن اندر خورد — کنون ای خردمند ارجِ خرد (ص ۹ جلد اوّل)

(۲) بہر جائے زر را فشاندہ ہمی — کہ او ارج زر راندانہ ہمی (ص ۱۲۶ جلد سوم)

(۳) گزان جاودان ارج یابید و چیز — یکے را مشے نامہ خوانید نیز (ص ۱۱۲ ")

(۴) بزرگ آن کہ با نامداران بساخت — مرا ارج ایران بباید شناخت (ص ۱۲۸ ")

اگرچہ ارج اور ورج اصل میں ایک ہی لفظ ہیں اور ان کے معنی

قدر و قیمت شان و شکوہ وغیرہ کے ہیں لیکن زلیخا میں ورج کے معنوں میں اور بھی عمومیت ہی۔ امثال اوّل و دوم میں ورج زیادہ تر برکت کرامت وغیرہ کے معنوں میں لایا گیا ہی۔

ہمزاد اِس کے معنی لغت میں ہم سن اور ہم سال ہیں لیسے رفیق پر بھی اطلاق ہوتا ہی جو سفر و حضر میں ہم پیالہ و ہم نوالہ ہو۔ نظامی ؎

نگہ کرد ہمزاد او خفتہ بود ہمان کرد با او کہ او گفتہ بود

(سکندر نامہ بحری ص۲۱)

یوسف زلیخا میں عموماً برادر کا مرادف ہی۔ امثال از زلیخا ؎

(۱) چو ہمزاد را آن چنان بستہ دید دل خستہ از دیدہ بیروں چکید (ص۶۹)

(۲) بدیدند ہمزاد خود را نژند سراپائے گشتہ گرفتار بند (")

(۳) توئی آن کہ ہمزاد را گرگ خورد ترا از برادر چنیں فرد کرد (ص۱۷۱)

(۴) منم آن کہ برمن ستم گرگ کرد منم آن کہ ہمزاد را گرگ خورد (ص۱۷۵)

زلیخا میں جب کہ وہ بیسیوں مقام پر ملتا ہی اور صاحبِ زلیخا کا روزمرّہ بن گیا ہی۔ تمام شاہ نامہ میں باوجودِ تلاش صرف ایک مثال داستان فرود میں ملی ؎

کہ پیوند شاہست و ہمزاد اوے سوارے ست نام آور و جنگجوے (ص۵۹۶ جلد اوّل)

قابوس نامہ: "کہ ملک ترا از برادرے شفق ہمزاد و دوست تر است"۔

(باب چہل و دویم اندر شرط اسفہسالاری ص۲۱۱)

استوار داشتن یا بودن اعتماد رکھنے کے معنوں میں زلیخا میں بالعموم رائج ہی۔ امثال ؎

(۱) ز بیم استوارش نبودی بکس خود او را نگہ دار بودی و بس (ص۳۳)

(۲) بیا یوسفِ خویش را گوش دار — مدارش بہیچ آدمی استوار (ص ۳۶)
(۳) ہمی داردش روز و شب در کنار — ندارد بہر کس ورا استوار (ص ۳۷)
(۴) بجس یک زمان استوارش نبود — بجز خود شب و روز یارش نبود (ص ۹۹)
(۵) بہیچ آدمی استوارش نبود — شب و روز بے او قرارش نبود (ص ۱۶۵)

ان معنوں میں شاہ نامہ میں صرف ایک مقام پر ملتا ہے۔ شاہ نامہ ؎

پرستندہ با وے بیامد چہار (۱) — کہ خاقان بدیشان بدی استوار (ص ۲۳ جلد چہارم)

ساقِ عرشِ خدائے شاہ نامہ میں یہ ترکیب نامعلوم ہے اور زلیخا میں مقبول ہے۔ امثال ؎

(۱) زمیدان چو بنہی قدم در سرائے — سرِ قبّہ بر ساقِ عرشِ خدائے (ص ۱۹۸)
(۲) خروشیدنِ کوس و زرّینہ نائے — ہمی رفت تا ساقِ عرشِ خدائے (ص ۲۱۱)
(۳) یکے نور زاندام آن دلکشائے — بہ پیوست تا ساقِ عرشِ خدائے (ص ۶۰)

آہ اظہارِ تاسف و حسرت کے وقت زلیخا میں ملتا ہے۔ امثال از زلیخا ؎

(۱) بنالید و گفت آہ دردو دریغ — کہ خواہد شدن ماہ عمرم بہ میغ (ص ۳۴)
(۲) ہمی راند سیل و ہمی گفت آہ — کہ فالیست این بس سیاہ و تباہ (ص ۳۶)
(۳) چو یوسف چنیں دید بر جایگاہ — دلِ مہربان بر تنش گفت آہ (ص ۵۲)
(۴) بسے گفت مسکین بسے گفت آہ — ز تیمار یعقوب دانش پناہ
(۵) پس آن اشک از دیدہ ہا کرد پاک — بر آورد آہ از دلِ دردناک (ص ۱۲۰)
(۶) ہمہ روز من گشت چون شب سیاہ — شبم شیون و زاری و درد و آہ (ص ۱۰۲)

شاہ نامہ میں آہ کا لفظ کل چار پانچ مقام پر ملتا ہے اور ایسے نازک وقت پر جب کہ انسان کاری زخم کھاتا ہے جس سے جانبری محال ہے۔ سہراب کی موت، شاہ نامہ ؎

بہ پیچید زاں پس یکے آہ کرد (۱) زنیک و بد اندیشہ کوتاہ کرد (ص۹ جلد اول)

شغاد کی موت

شغاد از پسِ زخم او آہ کرد (۲) تہمتن بر و دست کوتاہ کرد (ص۳۲ جلد سوم)

بہرام چوبین کا قتل

چو بہرام گفت آہ مردم زراہ (۳) برفتند پویان بہ نزدیک شاہ (ص۹۶ جلد چہارم)

معمولی تحسر اور تاسف کے وقت فردوسی بادِ سرد لکھتا ہے۔ شاہ نامہ[^]

چو روے پدر دید خسرو بدرد (۱) بر آورد از دل یکے بادِ سرد (ص۳۶ جلد چہارم)

بشد مغز و جان و سرم پُر ز درد (۲) بر آورد از دل یکے بادِ سرد (ص۱۸۱ جلد دوم)

بیامد بہ نزدیک خاقاں چو گرد (۳) پُر از خون دل و لب پُر از بادِ سرد (ص۱۸۹) ،،

کز ایرانیان چند جستم نبرد (۴) نزد پیشِ من کس جز از بادِ سرد (ص۲۲۲) ،،

گویا قدما کی بادِ سرد کا قائم مقام متاخرین کے ہاں آہِ سرد ہے۔

ویژہ بیاے مجہول و زاے فارسی، خاصہ و خالص و بیغش۔ اس صورت میں یہ لفظ دونوں ثنویوں میں ملتا ہے اور دونوں تصنیفات میں روزمرہ کا حکم رکھتا ہے۔ اس کی جمع **ویژگان** ہے۔ اس صورت میں خواص اور ندما کے معنوں میں آتا ہے۔ شاہ نامہ میں بالعموم رائج ہے۔ امثال از شاہنامہ[^]

خود و ویژگان با ہیونان چست (۱) بیامد بہ آسودگی راہ جست (ص۱۴ جلد سوم)

ازان ویژگان پنج تن را ببرد (۲) کہ بودند با مغز و ہشیار و گرد (ص۲۸ جلد دوم)

چو از قلبِ شاپور لشکر براند (۳) چپ و راستش ویژگان را بخواند (ص۱۰ جلد سوم)

ازان پس خود و ویژگان بر نشست (۴) میان کئی تاختن را بہ بست (ص۹۶) ،،

پس لشکر اندر ہمی رفت شاہ (۵) خود و ویژگان تا بہ نخچیر گاہ (ص۱۲۳) ،،

نظامی ؎ یکے روز با خاصگان سپاہ — چو مینو یکے مجلس آراست شاہ

ویژگان یوسف زلیخا سے مطلق غیر حاضر ہے - یہ امر قرینِ حیرت ہے کہ فردوسی اگر وہ یوسف زلیخا کا مالک ہے تو ویژگان کے استعمال سے اس مثنوی میں کیوں محترز ہے - اسی سلسلے میں مجھ کو بویژہ کا بھی ذکر کردینا چاہیے جو تاکید اور تخصیص کے لیے آتا اور شاہ نامہ میں علی العموم پایا جاتا ہے اور جس کو زلیخا میں قطعاً ترک کر دیا گیا ہے۔

بویژہ مرادف ہے بالخصوص کا شاہ نامہ سے مثالیں اور بھی واضح کردیں گی ؎

بویژہ دلاور سپہ دار طوس (۱) کہ در جنگ بر شیر دارد فسوس (ص ۳ جلد اول)

ہمہ راستی خواہم و نیکوئی (۲) بویژہ کہ سالار ایران توئی (ص ۵۶ جلد سوم)

مبادا کہ تنہا بود نام جوے (۳) بویژہ کہ دارد سوے جنگ روے (ص ۳ جلد چہارم)

یکے تاج بودی ازان بر سرش (۴) بویژہ کہ بیمار شد دخترش (ص ۹۵) ,,

کہ چونین سخن نیست جز کار زن (۵) بویژہ زنے کو بود راے زن (ص ۹۹) ,,

قرن پنجم میں بویژہ کا رواج گرشاسپ نامۂ اسدی ۴۵۸ھ سے ثابت ہے ؎

اسدی ؎ بویژہ دو کس را بہ بخشائے و بس — مدان خوار و بیچارہ تر زان دو کس

(ص ۱۷ طبع آقا محمد شیرازی بمبئی)

کیا یہ حقیقت حیرت بخش نہیں کہ بویژہ پر بھی زلیخا میں ویژگان کی طرح خطِ بطلان کھینچ دیا گیا ہے -

مثنوی یوسف و زلیخا ایک بڑی کتاب ہے جو کم و بیش آٹھ نو ہزار ابیات پر مشتمل ہے - اس میں یہ قیاس کرنا کہ بویژہ کے لیے کوئی مناسب موقع اور محل نہیں ملا، مہمل معلوم ہوتا ہے - دیکھا جاتا ہے کہ جہاں کہیں

اس کے استعمال کا موقعہ آتا ہے شاعر اس کا مرادف بخاصہ لاتا ہے چنانچہ زلیخا ؎

بخاصہ کہ یوسف چو او آدمی (۱) نہ دیدہ ہمی آسمان و زمی (ص ۳۴)
بخاصہ یکے بندۂ بے نوا (۲) کہ ہجدہ درم باشد او را بہا (ص ۵۰)
بخاصہ کہ از روم و چین آورند (۳) نہ زین شہرہا دین زمین آورند (ص ۱۰۹)
بہ یوسف بر آزار واجب ندید (۴) بخاصہ چنان کان گواہی شنید (ص ۱۳۰)
بخاصہ ابر ابن یامین فرد (۵) کہ گرگ از برادر ورا فرد کرد (ص ۱۶۹)

قابوس نامہ :۔ "و با مردم نادان صحبت مکن خاصہ با نادانی کہ پندارد دانا ست"
(باب ششم در فزونی گوہر در آموختن ص ۳۵)

حکیم سنائی ؎ حبذا آں جمال و مہر آرائے | مرحبا آن سپہر قلعہ کشائے
خاصہ وقتے کہ در مصاف بود | پائے او بر دماغ قاف بود

(حدیقہ ص ۶۵۰)

ارژنگ اس کی اور صورتیں یہ ہیں **ارتنگ** ۔ **اژنگ** ۔ **ارجنگ** ۔ **ارسنگ** ۔ **ارغنگ** ۔ **تنگ** **چنگ** اور **ژنگ** ۔ جس قدر اس کی شکل میں اختلاف ہے اسی قدر اس کے معنوں میں اختلاف ہے اور اہلِ قلم نے طرح طرح کی طبع آزمائیاں کی ہیں ۔ بعض کا خیال ہے کہ ارژنگ مانی کا اصلی نام ہے مان کا اعتقاد ہے کہ مانی ایک دعائیہ کلمہ تھا جو کثرت استعمال سے بالآخر لقب ہو گیا ۔ بعض کی رائے میں وہ کسی چینی بت خانہ کا نام ہے ۔
بعض کا قول ہے کہ وہ اس تختے یا کتاب کا نام ہے جس پر مصوّر اشکالِ غریبہ

نقش کرکے اپنے سامنے رکھتے ہیں، مصورانِ روم اِس کو تنگ اور نقاشانِ چین ارتنگ بتائے قرشت رنہ بشائے شخذ، کیونکہ فارسی ہیں یہ حرف نہیں آتا) کہتے ہیں (رشیدی) گویا یہ اسدی کو اصلاح دی گئی ہی جیساکہ آیندہ دیکھا جائے گا۔

بعض کا خیال ہی کہ اس کا اطلاق زبان پر بھی آتا ہی اور تاریخ کے معنی بھی دیتا ہی۔ (جہانگیری)

بعض کی رائے ہیں وہ کسی نقاش کا نام ہی جو چینی اصل اور مانی سے علیحدہ ہی اور کمال ہیں مانی کا ہم پایہ۔ امیر خسروِ دہلویؒ ؎

بہ در چین دیدہ ام ارژنگِ پرکار — کہ کردی دائرہ بے دورِ پرکار

(ولہ)

بہ قصرِ دولتم مانی و ارژنگ — طرازِ نقش می بستند بر سنگ

امیر خسروؒ نے شاید یہ معنی نظامی سے لیے ہیں ؎ نظامی

رواں کرد کلکِ شبہ رنگ را — بہ برد آب مانی و ارژنگ را

مگر قول مقبول یہ ہی کہ وہ مانی کے نگارخانے کا نام ہی یوسف اسفرنگ ؎

اگر مانی شود زندہ چو بیند نقشِ توصیفش — بمیرد باز از شرمِ نگارستانِ ارتنگش

(جہانگیری)

استاد عمعق بخاری

این چون بہار خانۂ چین پُر ز نقشِ چین — دان چون نگار خانۂ مانی پُر از بہار

(لباب، باب دہم ص۱۸۶)

عطا بن یعقوب الکاتب المتوفی ۴۹۱ھ

بمانند بت خانۂ چین منقش — بکردار ارژنگ مانی مصوّر (لباب حصہ اوّل۔ باب ششم۔ ص۷۳)

متاخرین کا قریب قریب یہی عقیدہ ہے۔

لیکن سب سے قدیم اور وقیع عقیدہ جو متقدمین میں عام تھا یہ ہے کہ وہ مانی کی کتاب اشکال کا نام ہے۔ چنانچہ یہی معنی لغات اسدی میں دیے گئے ہیں اور مثال میں فرخی کا یہ شعر منقول ہے ؎

ہزار یک زان کاندر سرشت او ہنرست — نگار و نقش ہمانا کہ نیست در ارتنگ

اسدی نے ساتھ ہی یہ بھی تشریح کر دی ہے کہ تائے قرشت کی بجائے زبانِ دری میں ثائے ثخذ سے لکھا جاتا ہے۔ وہ محض مرقع نہیں تھا بلکہ مصوّر کتاب تھی۔ فرخی کے اِس شعر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے ؎

نامۂ فتح تو ای شاہ بچین باید برد — تا چو آن نامہ بخوانند نخوانند ارتنگ

مسعود سعد نے اس کو اور بھی واضح کر دیا ہے ؎

دوزخ آرد پرستشِ ایشاں — راست ہستند نامۂ ارژنگ

ولہٗ

جہاں بزیب و بزینت چو لعبتِ آزر — زمین بہ نقش و بہ صورت چو نامۂ ارژنگ

تنہا ارژنگ مسعود سعد سلمان کے ہاں یوں آیا ہے ؎

زان کہ بستان شدہ از حسن بسانِ شکوے — زان کہ صحرا شدہ از نقش بسانِ ارژنگ

سنائی کے ہاں بھی یہی معنی دیتا ہے ؎

گرنہ ارتنگ مانی است آں خط — از چہ خط ہائے مقلگشت سقط

ولہٗ

چشمِ بد دور سخنت با معنی ست — ہمچو ارتنگ خامۂ (کذا) مانی ست

(حدیقۂ سنائی صفحہ ۵۱، ۵۲، نولکشور ۱۸۸۶ء)

لیکن ابوالمحاسن ازرقی کے ہاں گزشتہ معنوں میں سے کوئی بھی چسپاں

نہیں ہوتا ؎
شگفت شاخِ سمن گرد بوستاں گوئی ہمی برآورد دُرِّ ثمین سراز ارتنگ

(لباب باب دہم ص ۹۶)

آدم بر سرِ قصہ، یوسف زلیخا تنہا ارژنگ سے واقف نہیں لیکن اضافت کے ساتھ ارژنگِ مانی اس میں آتا ہے۔ زلیخا ؎

سر و پاے او چون بتِ آزری (۱) چو ارژنگِ مانی و جانِ پری (ص ۱۲۴)
ہمہ لشکر و پیل چون نو بہار (۲) چو ارژنگِ مانی برنگ و نگار (ص ۱۷۶)
سراے ست در پیش آراستہ (۳) چو ارژنگِ مانی بہ پیراستہ (ص ۱۶۸)
بماہی درش پاے و در ماہ سر (۴) چو ارژنگ مانی ہمہ پر صور (ص ۱۵۹)

ان اشعار پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب یوسف زلیخا کے نزدیک ارژنگ خواہ مصوّر کتاب ہو یا نگار خانۂ مانی سے علاقہ رکھتا ہے کیونکہ یہ مصنف ارژنگ کو مانی سے منسوب کیے بغیر لکھنا جانتا ہی نہیں۔ اس اعتقاد میں وہ سنائی، مسعود سعد سلمان، عطا بن یعقوب الکاتب، اسدی اور فرخی کا ہم زبان ہے۔

فردوسی شاہ نامہ میں ارژنگ کو جن معنوں میں لاتا ہے ان سے عموماً نہ ہمارے ادیب اور نہ اہلِ لغات واقف معلوم ہوتے وہ حسب ذیل ہیں ؎

(۱) ارژنگ دیو مازندرانی اور تورانی پہلوان پسر زرہ کا نام ہونے کے علاوہ جیسا کہ صاحب جہانگیری نے لکھا ہے ایک اور تورانی پہلوان کا نام ہے جو نژاو کی فوج سے علاقہ رکھتا ہے۔ شاہ نامہ ؎

یلانش بد ارژنگ و مردے شیر کہ ہرگز نہ بودند از جنگ سیر

("گریختن نژاو از بیژن و گرفتاری اسپنوی" ص ۱۶۰ جلد اوّل۔ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

(۲) ایک کنوئیں کا نام بھی ہے جس میں بیژن بن گیو افراسیاب کے حکم سے قید کیا جاتا ہے۔ شاہ نامہ ؎

به پیلانِ گردن کش آن سنگ را   که پوشد سرِ چاه ارژنگ را

(داستان بیژن ص ۲۰۹ جلد دوم)

اور فرخی ؎ نشست گاه تو بر تخت خسروانی باد   نشست گاه عدوی تو بر چه ارژنگ

(۳) وہ طلسم، جادو اور نیرنگ کے معنی بھی دیتا ہے۔ جب فریدون ضحاک کے ساختہ طلسم کو توڑ کر ضحاک کے محل سرا میں داخل ہو جاتا ہے اس واقعے کی اطلاع کندرو ضحاک کو جاکر دیتا ہے اور کہتا ہے ؎

ترا دشمن آمد بگاہت نشست   یکے گرزۂ گاؤ پیکر بدست

همه بند و نیرنگ و ارژنگ برد   دلآرام بگرفت و گاهت سپرد

(شاہ نامہ۔ جلد اول ص ۱۳)

(۴) اور عموماً تصویر کے معنوں میں آتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ فردوسی شاہ نامہ میں ارژنگ مانی کی ترکیب سے بالکل نابلد ہے۔ شاہ نامہ میں یا تو تنہا ارژنگ ملتا ہے جیسے اس شعر میں ؎

(۱) یکے نامہ بنوشت ارژنگ وار   براو کرده صد گونہ رنگ و نگار

(نامۂ پشنگ بہ کیقباد و آشتی خواستن ص ۶۱ جلد اول)

نیز اس شعر میں ؎

(۲) یکے نامہ بنوشت ارژنگ وار   پر آرایش و رنگ و بوے و نگار

(فرستادن خاقان دختر خود را با نامۂ خواستہ ہمراہ مہران بہ نزد نوشیروان ص ۲۳ جلد چہارم)

اور اس شعر میں ؎

(۳) به خاقان یکے نامہ ارژنگ وار   نوشتند پر بوے و رنگ و نگار

(نامۂ بہرام چوبیں بخاقان و سکّہ بنام خسرو پرویز زدن و فرستادن آن نزد ہرمز (ص ۹۲ ۔ جلد چہارم)
یا اضافت کے ساتھ ارژنگِ چین ملتا ہی جس کے معنی تصویر لیے گئے ہیں ۔
چنانچہ شاہ نامہ ؎

(۴) یکے نامہ بنوشت پر آفرین سخن وانِ چینی چو ارژنگِ چین

(آگاہی یافتن خاقان از رسیدن لشکر نوشیروان بگرگاں و نامہ نوشتن او در بارۂ آشتی ص ۲۰، جلد چہارم)

اور یہ شعر ؎

(۵) یکے نامہ برسانِ ارژنگِ چین نبشتند و کردند صد آفرین

(خواندن خسرو گردیہ را بدرگاہ ص ۱۰ جلد چہارم)

اِن اشعار میں ارژنگ کا اطلاق تصویر پر ہوا ہی اس کی تائید نظامی کے ان اشعار سے بھی ہوتی ہی ؎

(۱) یکے بود پیکر دو ارژنگ را تفاوت نہ ہم نقش و ہم رنگ را

(۲) کہ چوں کردہ اند این دو صورت گزار دو ارژنگ را در یکے سان نگار

(مناظرۂ رومیان و چینیان در صورت گری ۔ سکندر نامۂ برّی ص ۳۱۱ مطبع نامی لکھنؤ ۱۸۹۰ء)

یہ یاد رہے کہ فردوسی نے علی الرغم دیگر اساتذہ ارژنگ کو تصویر کے معنوں میں باندھا ہی جس میں نظامی کے سوا کسی اور نے اس کی تقلید بھی نہیں کی اور نہ یہ معنی کسی کتاب لغات یا فرہنگ میں پائے جاتے ۔ نظامی کے شارحین میں انھی ابیات کی تشریح میں جو یہاں درج ہیں ارژنگ کے معنوں کے متعلق بہت کچھ تذبذب اور پس و پیش ہی مثلاً پہلے شعر کی نسبت کہا گیا ہی " ازیں بیت صاف معلوم می شود کہ ارژنگ نام کار مصوران ست نہ نام نقاش نظیر مانی " اور ؎

درارژنگ ایں نقش چینی پرند　　　قلم بست برمانیِ نقش بند

اسکندر نامہ بری ص ۳۵ کی شرح میں کہا ہی (حاشیہ ۵۷) "بدان کہ ارژنگ از شعر خسرو علیہ الرحمۃ معلوم می شود کہ نام نقاشے است و درین جا ایں معنی درست نمی شود و مراد از ارژنگ ایں جا نقاشے ست ای در نقاشی چینی پرند"۔

دوسرے شارح نے اس قدر اور اضافہ کیا ہی کہ "ارژنگ نگار خانہ مانی باشد"۔ اور اس شعر کے واسطے ۵

زبس جادو یہاے فرہنگ او　　　بدو بگروید ند وارژنگ او

کہا ہی کہ "ازیں بیت ہم ظاہر می شود کہ ارژنگ بمعنی کارمانیست ای فنِ نقاشی و صنعتِ آں"۔ لیکن شعر (۲)، کو جو اوپر لکھ آیا ہوں خاموشی کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہی کیونکہ وہاں حضرتِ شارح کے مفروضہ معنی چسپاں نہیں ہوتے اصل یہ ہی کہ نظامی نے سکند نامہ میں ارژنگ کو کل دو معنوں میں باندھا ہی پہلے وہ ہی جو ہم فردوسی کے ہاں دیکھ آئے ہیں یعنی تصویر دوسرے وہی جو اسدی اور فرخی کے ہاں ملتے ہیں یعنی کتابِ مانی۔

یہ تفاوت آسانی سے مفہوم ہو سکتا ہی کہ زلیخا میں ارژنگ یا نگار نامہ ہی یا نگار خانہ اور شاہ نامہ میں تصویر اب یہ خیال کرنا کہ ایک مصنف نے اپنی دو تصانیف میں ایک لفظ کو دو مختلف معنوں میں باندھا اور جو معنی اور ترکیب ایک تصنیف میں اختیار کی دوسری تصنیف میں ترک کر دی کوئی صحیح حجت معلوم نہیں ہوتی۔ فردوسی کے نزدیک اِس کے معنی یا تصویر تھے یا کتاب اگر پہلے معنی تھے تو دونوں نظموں میں وہی معنی پائے جاتے اگر دونوں معنی جانتا تھا تو دونوں مثنویوں میں دونوں

معنی لاتا یہ کیا کہ ایک مثنوی میں ایک اور دوسری مثنوی میں دوسرے معنی لائے جائیں اور ترکیبیں بھی بدل دی جائیں، ایک میں کہے ارژنگِ چیں اور دوسرے میں کہے ارژنگِ مانی۔ شاہ نامہ میں فردوسی کو ارژنگِ مانی کے فقرے کے استعمال سے اگر وہ اس سے واقف تھا کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی تھی جس طرح کہ یوسف زلیخا میں ارژنگِ چیں کے استعمال سے۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان مثنویوں کے ناظم دو مختلف شخص ہیں جن کی معلومات مختلف ہیں۔ فردوسی کی شخصیت کو صاحب زلیخا کی شخصیت سے امتیاز کرنے کے لیے ہمارے واسطے اِسی قدر کافی ہے کہ وہ ارژنگ کو ایسے معنوں میں باندھتا ہے جو نہ صرف صاحب زلیخا بلکہ عام طور پر دیگر اساتذہ کو بھی معلوم نہیں۔

فرخی اور اسدی اگرچہ ارتنگ یا ارژنگ کو مانی کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن فردوسی جو بحیثیت زمانہ اِن دونوں شاعروں سے مقدم ہے نیز بحیثیت مورخِ ایران مانی کے حالات سے مذکورالصدر شعرا کے مقابلے میں زیادہ باخبر ہونا چاہیے ارژنگ کا مانی سے کوئی علاقہ تسلیم نہیں کرتا اگرچہ وہ مانی کی صورت گری کا معتقد ہے۔ چنانچہ شاہ نامہ سے

بیامد یکے مرد گویا ز چین | کہ چون او مصوّر نہ بیند زمین
بدان چرب دستی رسیدہ بکام | یکے پُر منش مرد مانی بنام
بصورت گری گفت پیغمبرم | ز دین آوران جہان برترم

(آمدن مانی مصوّر نزد شاپور بہ دعوے پیغمبری وکشتہ شدن او۔ ص ۱۰۱ جلد سوم)

اور نظامی سے شنیدم کہ مانی بصورت گری | ز رے سوے چیں شد بہ پیغمبری

(سکندر نامۂ بری ص ۳۱۲)

مانی کی نسبت یہ عقیدہ عرب مورخین کے بیانات پر اعتبار کرتے ہوئے غلط معلوم ہوتا ہے۔ لیکن نہ فردوسی اور نہ مانی کے عرب مورخ مانی کی مشہور کتاب ارژنگ یا ارتنگ کا ذکر کرتے ہیں اور فردوسی نہ شاہ نامہ میں اور نہ مانی کے حالات میں کسی مقام پر بھی اس عام عقیدے کا معتقد اور پابند نظر آتا ہے جس میں فرخی، اسدی، عطا بن یعقوب، مسعود سعد سلمان اور حکیم سنائی اعتقاد رکھتے ہیں۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر یوسف زلیخا فردوسی کے قلم سے نکلتی تو مانی کے متعلق یہ ایک غیر تاریخی بیان جو ارژنگ مانی کے فقرے میں مرموز ہے فردوسی کے قلم سے ادا نہ ہوتا۔

نامہ۔ اِس لفظ کے استعمال سے زلیخا میں کئی کنایے حاصل کیے گیے ہیں۔ شاہ نامہ میں یہ صورت نظر نہیں آتی۔ زلیخا۔ امثال ؎

(۱) وگرنہ شود جانت جفتِ ہلاک — شود اسمت از نامۂ عمر پاک (ص۳۰)

(۲) عزیز اندران داوری خیرہ ماند — دلش نامہ و راہ اندیشہ خواند (؍؍)

(۳) بہفت آسمان در فرشتہ نماند — کہ او نامۂ درد یوسف نخواند (ص۴۲)

(۴) تو ای بانو این نامہ را در نورد — بگرد سخن ہائے بیہدہ مگرد (ص۱۱۵)

(۵) دورہ بر من این داستان خواندۂ — ہمین نامہ بر من دورہ خواندۂ (ص۱۱۸)

ادائے مطالب

شاہ نامۂ عظیم کا مصنف فردوسی ہمارا خیال تھا کہ ادائے مطالب میں غیر محدود الفاظ، گوناگوں بندش اور ترکیب کے ذخیرے کا مالک ہوگا اور جس طرح اور جس پہلو چاہتا ہوگا اپنا مطلب ادا کر دیتا ہوگا۔ اس بارے میں وہ ہم کو بالکل مایوس کرتا ہے، جب کوئی ایک خیال شاہ نامہ کے دوران میں اس کو کئی مقام پر ادا کرنا ہوتا ہے تو وہ اس کے اظہار میں زیادہ تنوع، رنگارنگی اور

اختلاف سے کام نہیں لیتا بلکہ قریب قریب ان ہی الفاظ میں اس کو دہراتا ہے جس سے نتیجہ یہ نکلا کہ خیالات کی تکرار کے ساتھ ساتھ الفاظ اور جملوں کی تکرار شاہ نامہ میں اکثر مقامات پر مشاہدہ کی جاتی ہے۔ تمثیلاً میں ادائے سجدہ کے خیال کو لیتا ہوں۔ فردوسی اس مقصد کو ان صورتوں میں ادا کرتا ہے۔

(۱) نماز بُردن (۲) روئے بر زمین مالیدن

(۳) رُخ بر خاک نہادن (۴) روے بر خاک مالیدن

(۵) رخ بر تیرہ خاک مالیدن (۶) رُخ بر زمین مالیدن

(۷) رُخ بخاک مالیدن (۸) رخسارگان بر زمین مالیدن

زلیخا شاہ نامہ کے مقابلے میں اگرچہ ایک مختصر نظم ہے لیکن اس مثنوی میں یہی مقصد ذیل کی شکلوں میں اظہار ہوا ہے۔

(۱) نماز بُردن (۲) روے زمین بُرخ ستردن (۳) روے زمین بچہرہ ستردن
(۴) روے برخاک تاری نہادن (۵) چہرہ برخاک تاری بسودن (۶) رُخ برخاک تیرہ بسودن
(۷) رُخ بر روے زمین نہادن (۸) رُخ بر زمین نہادن (۹) چہرہ برخاک تاریک مالیدن
(۱۰) رو بخاکِ سیہ مالیدن (۱۱) زمین بچہرہ رُفتن (۱۲) خاک زمین را بر رفتن
(۱۳) روے برخاک مالیدن (۱۴) رُخ بر تیرہ خاک نہادن (۱۵) رُخسار بر تیرہ گِل مالیدن
(۱۶) دو رُخ بر زمین نہادن (۱۷) چہرہ بر خاک مالیدن۔

اسی طرح گستردن کا حال ہم دیکھتے ہیں۔ شاہ نامہ میں عموماً اس فعل کے ساتھ یہ اسما آتے ہیں۔

(۱) فرش گستردن (۲) دام گستردن (۳) کام گستردن (۴) مہر گستردن
(۵) پر گستردن (۶) آفرین گستردن (۷) داد گستردن (۸) کین گستردن
(۹) بساط گستردن

زلیخا میں اس کے ساتھ مرقومۂ ذیل اسما آتے ہیں :

(۱) سخن گستردن (۲) آگہی گستردن (۳) بلا گستردن (۴) داستان گستردن
(۵) قصہ گستردن (۶) خردمندی گستردن (۷) گفتار گستردن (۸) دین گستردن
(۹) فرمان گستردن (۱۰) نعمت گستردن (۱۱) دعا گستردن (۱۲) راز گستردن
(۱۳) نامہ گستردن (۱۴) عاشقی گستردن (۱۵) تخم گستردن (۱۶) لابہ گستردن
(۱۷) دام گستردن (۱۸) فرش گستردن (۱۹) بساط گستردن (۲۰) داد گستردن

اِن امثلہ سے دیکھا جا سکتا ہے کہ صاحب زلیخا کے ہاں جو رنگا رنگی اور بوقلمونی ہے فردوسی میں اس کا نصف بھی نہیں۔ اِس سے فردوسی پر کوئی حرف گیری نہیں کی جا سکتی بلکہ یہ ماننا ہوگا کہ زلیخا کے زمانے میں فارسی زبان فردوسی کے عصر کے مقابلے میں بدرجہا ترقی کر چکی تھی۔ جب کہ صاحب زلیخا کو ادائے مطالب کے لیے ایک بے حد وسعت اور گنجایش مل گئی ہے فردوسی ایک محصور تنگنا میں سلسلہ برپا ہے۔

کسی اور موقع پر دونوں اُستاد اسی ایک مقصد کے اظہار میں ایک ہی ایک پیرایے کو دوہرا رہے ہیں۔ ذیل کی امثال سے روشن ہوگا کہ دونوں استاد کس قدر مغائر اور اپنی اپنی طرز میں مصر ہیں دونوں اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ فلاں عہد سے فلاں عہد تک۔ امثال :-

یوسف زلیخا	شاہ نامہ
از آدم درون تا بدیں روزگار نہان را بد و کردہ ایم آشکار	زگاہِ منوچہر تا کیقباد ازان نامداران کہ داریم یاد (ص ۲۶۴ ج ۱)
از آدم درون تا بہ محشر گناہ بہ بخشی بیک رحمت ای داد خواہ (ص ۱۶)	زگاہِ منوچہر تا کیقباد زکاؤس تا شاہ فرخ نژاد (ص ۲۶۴ ج ۱)

از آدم درون تا بروزِ شمار — زگاہِ منوچہر تا کیقباد
ازین خوب تر کس ندیدست کار (ص۱۹) — کسے دین یزدان نیاورد یاد (ص ۲۴ ج ۳)
از آدم درون تا بدین روزگار — زگاہِ کیومرث تا یزدگرد
کہ او بود پیغمبرِ روزگار (ص ۵) — بہ نظمِ من آید پراگندہ گرد (ص ۲۳۴ ج ۳)

فردوسی جب کہ معمولی اور صاف الفاظ میں اپنا مطلب ظاہر کررہا ہی صاحب زلیخا اسی مقصد کو ایک محاورے کے ذریعے ادا کرتا ہی یعنی از آدم درون تا ایں یہ ایک ایسی نادر صورت ہی جس سے فردوسی شاہ نامہ میں قطعاً نا بلد ہی البتہ گرشاسپ نامہ میں ہم اس سے دوچار ہوتے ہیں
اسدی ؎ ز تور اندرون تا گرشاسپ خاست — گزر کردہ بد چار صد سال راست
(گرشاسپ نامہ ص ۲۳)

علیٰ ہذا خواب دیکھنے کے مقصد کو فردوسی عموماً در حرف ظرف یا باے ظرف کے ساتھ ادا کرتا ہی مثلاً در خواب دیدن یا بخواب دیدن۔ خال خال صورتوں میں حرف ظرف ترک بھی کردیے گئے ہیں لیکن اس قدر قلت کے ساتھ کہ کل شاہ نامہ میں شاید دو تین مثالیں اس قسم کی ملیں۔ صاحب زلیخا اس مطلب کو بالعموم بلا وصل حروفِ ظرف خواب دیدن لکھتا ہی اگرچہ بعض اشکال میں وہ حرف ظرف بھی لاتا ہی۔
امثال از زلیخا ؎

(۱) یکے خواب دیدم من ای شہریار — کہ ہرگز نہ دیدہ کسے در دیار (ص ۱۴۴)
(۲) وگر خواب دیدی کسے سخت و سُست — پسندیدہ تعبیر کردی درست (ص ۱۳۹)
(۳) دلم دوش دیدہ است خوابے شگفت — ندانم چہ اندازہ باید گرفت (")
(۴) دگر گفت من خواب دیدم چنان — کہ بر سر کشیدم ہمی بار نان (ص ۱۴۰)

چند مثالیں شاہ نامہ سے بھی نقل کی جاتی ہیں ؎

(۱) چنیں دیدہ در خواب کز کوہ ہند — درفشے برافراختندے بلند (ص۲۹ جلد اوّل)

(۲) بپرسید از و دختِ افراسیاب — کہ فرزانہ شاہا چہ دیدی بخواب (ص۱۲۵) ؍؍

(۳) چناں دید روشن روانش بخواب — کہ رخشندہ شمعے برآمد ز آب (ص۱۸۰ جلد دوم)

(۴) چناں دید گوینده یک شب بخواب — کہ یک جام مے داشتے چوں گلاب (ص۲ جلد سوم)

اسی طرح ہاتھیوں کے پانو میں روندے جانے کے خیال کو دونوں استادوں نے باندھا ہے۔ فردوسی کہتا ہے ؎

وگر ہیچ کژّی گمانے برم — بزیرِ پئے پیل تان بسپرم (ص۲۳ جلد اوّل)

زلیخا میں آتا ہے ؎

بزیرِ پئے پیل تان افگنم — بن و بیخ تان از جہاں برکنم (ص۱۶۳)

ظاہر ہے کہ مقابل فقروں میں افعال سپردن اور افگندن میں فرق ہے اور سپردن افگندن کے مقابلے میں زیادہ فرسودہ اور پارینہ معلوم ہوتا ہے۔

کسی اور مثال میں دونوں استادوں کے خیالات ایک ہی سمت سفر کر رہے ہیں۔ فردوسی کہتا ہے ؎

و دیگر کہ از تو مگر کردگار — نشاند یکے کودکم درکنار (ص۸۶ جلد اوّل)

صاحب زلیخا یہی مطلب یوں قلم بند کرتا ہے ؎

دعا کن مگر ایزد کردگار — نشاند مرا کودکے درکنار (ص۱۰۷)

مقابلہ دونوں آخری مصرعوں میں ہے اور فرق اس قدر ہے کہ فردوسی کے ہاں ترکیب ذرا پرانی ہے اور زلیخا میں مقابلۃً جدید۔

کنایات و محاورات

ذیل کے محاورات جو زلیخا سے منقول ہیں شاہ نامہ میں نظر نہیں آتے۔

(۱) خلیدہ جگر زیر دناداں مار بودن (۲) برآوردن درخت مراد از بُن
(۳) داروے مہر کسے خوردن (۴) چہرۂ بخت را طپانچہ زدن
(۵) نامۂ چیزے درنوردن (۶) در عاشقی فرو کوفتن
(۷) گل دولت از باغ شادی چیدن (۸) ارزیز بر چشم بخت ریختن

اِن کی بندش کہ رہی ہو کہ وہ ایسے وقت کی یادگار ہیں جب زبان میں ایک معتد بہ حصے تک رنگینی اور حلاوت کی چاشنی پیدا ہو چکی تھی جو بات فردوسی کے عہد میں قلت کے ساتھ معلوم تھی۔

برخلاف اس کے شاہ نامہ میں ایسے محاورات اور کنایات آتے ہیں۔

(۱) گلیم اندر آب افگندن (۲) گوز بر گنبد افشاندن (۳) آب در زیر کاہ بودن
(۴) طبل بزیر گلیم کوفتن (۵) گاؤ پیسہ بچرم اندر بودن (۶) ماہی بہ خشکی بردن
(۷) کار امروز دا بفردا ماندن (۸) آب از تارک برتر گزشتن۔

شاہ نامہ میں ایک کنایہ خشت خام درآب افگندن (کنایہ از کار بے سود کردن) آتا ہو۔ شاہ نامہ ؎

چو کردار با ناسپاسان کنی ہمی خشت خام اندر آب افگنی

زلیخا میں اس کے قریب قریب یوں آتا ہو شعر

ہر آں گہ کہ اُفتاد در آب خشت مرا باک نبود ز باران چو کشت

لیکن صاحب زلیخا کا مقصد بالکل مختلف ہو جس کو شاہ نامہ میں کشتی بہ آب انداختن کے ذریعے سے ادا کیا گیا ہو ؎

تو کشتی بآب اندر انداختی ز رستم ہمی چاکری خواستی (ص ۲۰) جلد سوم

لا اعلم مصرع ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

فردوسی کے ہاں ایک اور کنایہ خورشید را چون توان نہفتن آتا ہو شاہ نامہ ؎

یکایک بمرد گران مایہ گفت — کہ خورشید را چون توانی نہفت (ص۲۱ جلد اول)

یوسف زلیخا میں اس کی شکل شمس اندودہ داشتن بگل میں تبدیل کر لی گئی ہے۔ زلیخا

کہ اولاد او فانیند (کذا) و خجل — ہمی شمس اندودہ دارد بگل (ص؟)

اسدی طوسی ؎ چنیں داد پاسخ بتِ دل گسل — کہ خورشید پوشید نتوان بگل (گرشاسپ نامہ ص۱۸)

مولانا نظامی گنجوی ؎

برآشفت نوشابہ زان شیر دل — کہ پوشید خورشید را زیر گل

ولہٗ

کہ با من چہ سود ست کوشیدنت — بگل روے خورشید پوشیدنت

(سکندر نامۂ بری ص۲۱۶۔ مطبع نامی لکھنؤ ۱۸۹۸ء)

بہار الدین محمدؐ بن المؤید بغدادی۔ شعر

چو آفتاب یقینت شود کہ بے جرمم — گر آفتاب بگل بیش ازیں نیندائی

(لباب۔ باب ششم۔ ص۱۳۱)

قاضی امام مجد الدین النسوی ؎

چو ماہِ عمرِ تو اندر محاقِ پیری شد — تو آفتاب حقیقت بگل چہ اندائی

(لباب۔ فصل دوم بابِ ہفتم ص۲۳۵)

اس کنائے کی آخری شکل یہ قرار پائی۔

"فصل فصلِ او اثبات کردن آبِ دریا بغربیل پیمودن بود و چشمۂ آفتاب را بگل اندودن"۔

(محمد عوفی۔ لباب الالباب، فصل دوم از باب ہفتم ص۲۲۹)

سعدی ؎ بگفت آنچہ دانست پاکیزہ گفت — بگل چشمۂ خور نشاید نہفت (بوستان)

امثال بالا سے ہم کو اس قدر علم ہو گیا کہ فردوسی اور اس کا متتبع اسدی طوسی آفتاب بگل اندودن، کے کنائے سے واقف نہ تھے۔ یعنی اس کی یہ شکل ان ایام میں رائج نہ تھی۔ برخلاف اس کے صاحب زلیخا اس محاورے سے واقف معلوم ہوتا ہے جس کو بہ ضرورتِ شعر "شمس بگل اندودن" لکھتا ہے۔

توصیفات زلیخا میں اسماے صفات ذیل کی صورتوں میں پائے جاتے ہیں۔

(۱) سپہرِ وفا آفتابِ ہنر	(۲) کہ ای گلشنِ حسن وخورشید چاہ
(۳) خردمند لاوے چراغِ بصر	(۴) چراغِ جہاں یوسفِ ژرف یاب
(۵) ہنرمند یوسف چراغِ زمن	(۶) سرافراز راحیل پاکیزہ کیش
(۷) بہ لیبائے پرمہر فرہنگ یاب	(۸) زلیخائے مہ پیکرِ پیش بین
(۹) نکو نام یعقوب فرخ خصال	(۱۰) رُخِ روشنش کیمیاے جلال
(۱۱) بواے زلیخا بتِ سنگ دل	

اِن میں اکثر مرکباتِ توصیفی اس قسم کے ہیں جن کو تشبیہی اضافات نے ترکیب دیا ہے شاہ نامہ میں تشبیہی اضافات کا قلت کے ساتھ رواج دیکھا جاتا ہے اور ایسے مرکبات مثلاً کیمیائے جلال۔ گلشنِ حسن۔ چراغِ بصر۔ چراغ جہاں چراغ زمن۔ چراغ دل اور فرہنگ یاب بالکل نامعلوم ہیں۔ چراغ کی تشبیہ زلیخا میں بالخصوص بہت عام ہے۔ شاہ نامہ میں اِس قسم کی ایک مثال بھی نہیں ملی۔

علاوہ ازیں زلیخا میں دیکھا جاتا ہے کہ اسماے صفات کے انتخاب میں خوش سلیقگی سے کام نہیں لیا جاتا۔ بعض مثالیں پیش ہیں۔ زلیخا ؎

بنزدیکی خوان بدانش نشست　　　کشیدش سوِ خوان فرہنگ دست (ص ۱۸۰)

یہ شعر اس وقت آتا ہے جب حضرت یامین حضرت یوسف کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھتے ہیں۔ خوان کے لیے خوانِ دعوت، خوانِ نعمت وغیرہ مشہور صفات ہیں۔ شاعر نے ان سے احتراز کرکے خوان فرہنگ لکھا ہے۔ ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ خوان کو فرہنگ سے کیا مناسبت ہے؟

کہ مسکین زلیخاے فرہنگ جوے | بدین بندۂ خود سیہ کرد روے (ص ۱۳۰)

یہ وہ موقع ہے کہ عزیز مصر پر حضرت یوسف کی بے گناہی کا نقش جم جاتا ہے لیکن بدنامی کے خیال سے زلیخا کو بھی سزا دینا نہیں چاہتا۔ اس موقع پر زلیخا کو فرہنگ جوے کہنا کون سی خوش مذاقی کی دلیل ہے۔

ذیل میں کچھ امثال شاہ نامہ سے پیش ہیں ؎

چمانندۂ دیزہ هنگام گرد (۱) چرانندۂ کرگس اندر نبرد
فزایندۂ باد آورد گاہ فشانندۂ خون ز ابرِ سیاہ
گرایندۂ تاج و زرّیں کمر نشانندۂ شاہ بر تختِ زر (ص ۳۵) جلد اوّل
گرایندہ گرز و کشایندہ شہر (۲) ز شادی بہر کس رسانندہ بہر
کشندہ درفشِ فریدون بجنگ کُشندہ سرافراز جنگی پلنگ (ص ۴۹) جلد اوّل
پناہِ گوان پشت ایرانیان (۳) فرازندۂ اختر کاویان
سرافراز گردن کشِ پیل تن سزاوار ہر شہر و ہر انجمن
خداوند نیروی و فرزانگی نگہدار گیتی بہ مردانگی (ص ۴۷) جلد اوّل
نبیرہ جہاندار کاؤس کی (۴) دل افروز و پردانش و نیک پی (ص ۲۰۴) جلد دوم
خداوند دولت خداوند زور (۵) جہان گیر و بخشندہ بہرام گور (ص ۱۳۰) جلد سوم
وزان پس شود شہریاری بلند (۶) جہاندار و نیک اختر و سودمند (ص ۸) "
سخن گوی و روشن دل و یادگیر (۷) خردمند و دانا و گرد و دبیر (ص ۷) جلد چہارم

جہاں دار باداد و نیکو کنش (۸)، فشانندۂ گنج بے سرزنش
فزایندۂ نام و تختِ قباد گزارندۂ تاج و اورند و داد (ص۳۰، جلد چہارم)

حروف عاطفہ کے ساتھ اسمائے صفات کو ترکیب دینا فردوسی کے ہاں زیادہ رائج ہے۔ زلیخا میں یہ صورت خال خال موقعوں پر ملے گی۔ علیٰ ہذا ایسی ترکیبیں مثلاً نشانندۂ شاہ۔ ستانندۂ گاہ۔ فشانندۂ گنج۔ گزارندۂ تاج۔ فزایندۂ نام، زلیخا میں غیر حاضر ہیں۔

عربیت پیشتر ایما کیا جا چکا ہے کہ زلیخا میں عربی الفاظ کی آمیزش ایک غیر ضروری حد تک دیکھی جاتی ہے۔ یہاں اس مفہوم کو زیادہ وضاحت دینے کے خیال سے اس قسم کی چند مثالیں دی جاتی ہیں۔ امثال ہ

(۱) چنیں گفت الٰہی بآلائے خویش با جلال و اعزاز و نعمائے خویش (ص۹۷)
(۲) ہمان شہرہا و نواحی تمام ہمہ ملک معمور باآن نظام (ص۱۵۱)
(۳) چو بر شد بمنبر بدین حسن و زیب گسست از ہمہ خلق صبر و شکیب (ص۹۳)
(۴) بدین ظن زنان جملہ دیدند فرض بد و خویشتن جملہ کردند عرض (ص۱۳۵)
(۵) وفا داده بد مر براہیم را مرآن اصل تبجیل و تعظیم را (ص۴۲)
(۶) زنا دانی آن خواب‌ہا خاص و عام نہادند اضغاث احلام نام (ص۱۴۴)
(۷) مرا با چنیں حسن و چندین جمال نخواہی حدیثے ست صعب و محال (ص۱۱۴)

عربی الفاظ کی فارسی افعال کے ساتھ ترکیب کی مثالیں:

بنظم آوردن۔ نظم آراستن۔ لطف کردن۔ تضرّع نمودن۔ فرح دادن۔ سفر اُفتادن۔ نسب ساختن۔ کفارت کردن۔ نقصان بودن۔ معزول کردن۔ مخذول کردن۔ تحیات کردن۔ عفو خواستن۔ فضل داشتن۔ عزّت نہادن۔

سنع کردن۔ فرو کردن۔ بضاعت داشتن۔ موقع فتادن۔ عقوبت رساندن۔ سیاست کردن۔ ضائع شدن۔ رسوم نہادن۔ عقد بستن۔ خطبہ خواندن۔ فلاح یافتن۔ اِن مرکب افعال میں سے اکثر شاہ نامہ سے غیر حاضر ہیں۔

فارسی اضافت کے ساتھ عربی الفاظ کی ترکیب:۔ اصلِ تجیل۔ عیبِ عظیم۔ تادیلِ احلام۔ عزیز ذلیل۔ مالک رقاب۔ فرش عظیم۔ حُرمتِ عظیم۔ کمالِ عظیم۔

عربی فارسی الفاظ کی ترکیب:۔ تعبیرِ خواب۔ روے ایجاب۔ آیت دوری۔ کیش عظیم۔ جاہ عظیم۔ نقش مانی۔ در عاشقی۔ نقشِ چینی۔ نامۂ عمر۔ سلبہائے زر۔ کار سمائی۔ گل معجزہ۔ خون مزدور۔

اضافت کا استعمال:۔ قرصۂ شمس گیتی فروز۔ سررشتۂ صبر۔ قرصۂ آفتاب شکر خدائے جہان آفرین

فارسی حروف کے ساتھ عربی الفاظ کا استعمال:۔ از ین نوع۔ بدین نوع۔ بے مونس۔ قضا را۔ بارضا۔ حرمتگہ۔ کثیر و قلیل۔ بے محابا۔ با نظام۔ اندک نظیر۔

گزشتہ بالا ترکیبوں میں سے جو زلیخا سے منقول ہیں اکثر صورتیں شاہ نامہ سے غیر حاضر ہیں۔

زلیخا کے برخلاف شاہ نامہ میں عربیت کا اثر نہایت دُھندلا ہی۔ اس کا اصلی سبب یہ ہی کہ فردوسی کے عہد تک فارسی زبان عربی کے اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے میں کامیاب رہی تھی۔ ابتداءً صرف چند ضروریات کی بنا پر عربی خرمن سے خوشہ چینی کی گئی تھی۔ ان میں سب سے پہلے مذہبی ضرورت تھی۔ اس بنا پر ہر مسلمان کے لیے اپنی مذہبی

مصطلحات کا جاننا ضروری تھا جو عربی تھیں۔مثلاً دعا۔ درود۔ سلام۔ حلال۔ حرام۔ حمد۔ ثنا۔ حدیث وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے اس عہد کی ضروریاتِ زندگی کی بنا پر بھی عربی الفاظ کا ایک محدود اور ضروری ذخیرہ مستعار لیا گیا تھا۔مثلاً صندوق۔ شمع۔ منبر۔ قرطاس۔ قیر۔ قار۔ ملحم۔ معصفر۔ منزل۔ مجلس صحرا۔ حرف۔ جمال۔ حُسن۔ عشق۔ عید۔ ساقی۔ قدح۔ تیسری ضرورت میں علمی اصطلاحات تھیں جن کے لیے فارسی زبان میں کوئی لفظ موجود نہیں تھا۔ مثلاً نظم۔ نثر۔ شعر۔ بیت۔ غزل۔ قصیدہ۔خط وغیرہ وغیرہ۔ چوتھے قصائد میں شعرا لفظی شان وشوکت۔ لفّاظی اور قوافی کی ضروریات سے بھی عربی الفاظ مستعار لیتے رہے تھے۔ تاہم یہ عربی ذخیرہ فارسی میں ایک محدود پیمانے پر تھا اور اکثر ایسا تھا جس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔

شاہ نامہ اس کی سب سے بہتر مثال پیش کرتا ہے۔ اس میں وہی عربی الفاظ ملتے ہیں جو مختلف ضروریات کی بنا پر فارسی میں رائج الوقت ہو چکے ہیں اور فارسی روزمرہ میں داخل ہیں۔ اِن میں سے بعض کی امثال اوپر دی جا چکی ہیں۔ علاوہ ازیں فردوسی خود بھی ایسے الفاظ عربی سے وام لیتا ہے جن کی اشد ضرورت محسوس کرتا ہے۔ مثلاً بیت اور نظم۔ فارسی میں اِن کا کوئی مرادف نہیں ملتا اس لیے ان ہی پر متصرف ہوگیا۔ نظم و نثر کا ترجمہ اِس نے پیوند اور پراگندہ کیا ہے لیکن ان پر خود اس کو اطمینان نہیں ہے قافیے کی ضرورت سے بھی وہ گاہے گاہے عربیت کا منت پذیر ہوتا ہے۔مثلاً منجنیق، شاہ نامہ میں اس لفظ کے بغیر گزارہ دشوار تھا اِس لیے وہ تو لے لیا لیکن قافیہ کی ضرورت سے ایک اور لفظ کی تلاش ہوئی۔فارسی میدان میں اس کی جستجو بے سود

تھی ناچار عربی سے جاثلیق وام کیا۔ اب شاہ نامہ میں جہاں کہیں قافیۂ
اوّل منجنیق ہے قافیۂ ثانی بلا استثنا جاثلیق ہے۔ اسی طرح لفظ نیا (جد مادری
و پدری) کے قافیے کے لیے کیمیا اور کف کے لیے صف تلاش کیے گئے۔
یا بعض مصطلحاتِ جنگ ہیں۔ مثلاً ساقہ۔ میمنہ۔ میسرہ۔ قلب جناح
وغیرہ۔ ابتدا میں دقیقی کے تتبع میں فارسی راست۔ چپ۔ میاں گاہ۔
پس پشت۔ یک دست اور دست دگر کی ترویج کی لیکن بعد میں اُن کو
ترک کر کے عربی اصطلاحات پر قناعت کرلی۔ عربیت سے فردوسی کا اجتناب
اس ایک چھوٹی سی مثال سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ مختصر اور پیش پا اُفتادہ
الفاظ تعبیر و مُعبّر سے اعراض کر کے اِن کی جگہ ایسے لمبے فارسی الفاظ
مثلاً "گزارشِ خواب" "گزاریدن خواب" اور "گزاردۂ خواب" لاتا ہے
قدما نے یہی سلوک "عید قربان" کے ساتھ کیا ہے جس کو "جشن گوسفند
کشاں" یا "عید گوسفند کشاں" کہا جاتا تھا۔ رودکی ؎

بادبر تو مبارک و خنشاں　　　　جشنِ نوروز گوسفند کشاں

لیکن سلجوقی عہد سیاسی انقلاب کے ساتھ ساتھ اقلیم زبان پر
بھی انقلاب لاتا ہے اس دور کی نسلوں کا مذاق بدل چکا تھا۔ اس عہد
میں دری فارسی یا خالص فارسی لکھنا بد مذاقی میں داخل تھا۔ عربی
نمونوں کے مطابق سجع نے فارسی میں بھی اپنا قدم جمایا جس کے
خلاف بعض حلقوں میں صدائے احتجاج بھی بلند کی گئی۔ نئے مذاق
اور سجع پسندی نے زبان پر عربی الفاظ کا عنصر غالب کر دیا جس کے
لیے کوئی خطِ حد بندی قائم نہیں رہا۔ اِس زمانے کے ادیب خالص
فارسی لکھنے سے لوگوں کو مانع آتے تھے۔ امیر کیکاؤس قابوس نامہ میں

لکھتا ہی:-

"واگر نامۂ بود پارسی۔ پارسی مطلق منویس کہ ناخوش بود۔ خاصہ پارسی دری کہ نہ معروف بود" (باب سی و نہم)

عربی کے واسطے جو جنون اس دور میں محسوس ہو رہا تھا اس کی وسعت اس مثال سے مفہوم ہو سکتی ہی کہ قدما کے ہاں "شگفت بماندن" ایک عام محاورہ ہی۔ شاہ نامہ ؎

زگفتارِ او ماند خسرو شگفت　　چو شرم آمدش پوزش اندر گرفت (ص۶۶) جلد چہارم

اب یہ محاورہ اگرچہ جاری رہتا ہی لیکن اس اصلاح کے ساتھ کہ شگفت ماندن کے بجائے عجب ماندن نے رواج پایا اور میدان وقت گزرنے پر موخر الذکر ہی کے ہاتھ رہا۔

یہی سلوک قدما کے محاورہ "بند بستن" کے ساتھ کیا گیا ہی۔ شاہ نامہ ؎

بہ فرمود تا رفت مہراب پیش (۱) بہ بستند بندے بہ آئین و کیش (ص۱۲۳) جلد اوّل

بہ بستند بندے بہ آئین و کیش (۲) بدانسان کہ بود آن زمان دین و کیش (ص۶۰) "

متاخرین نے اس میں بھی یہی ترمیم کی کہ فارسی بند کو ترک کرکے اس کی جگہ عربی عقد کو رواج دیا۔ زلیخا ؎

بتز و یج پیغمبر پاک دین　　بدین پر ہنر دختر مہ جبین

بخوان خطبہ و عقد شان بستہ کن　　دل ہر دو شان راز ہم رستہ کن (ص۲۲۲)

آج بند بستن اسی قدر غیر معروف ہی جس قدر کہ اس کا قائم مقام عقد بستن یا عقد کردن مشہور ہی۔

زلیخا کی عربیت پر نظر ڈالتے ہوئے مشکل سے امید کی جاتی ہی کہ وہ فردوسی یا اس کے عہد کی تصنیف ہو۔ کیونکہ جب شاہ نامہ اس نے

زبان رائج الوقت میں لکھا ہو تو زلیخا کی زبان کو سکۂ رائج نہیں کہا جا سکتا۔ زلیخا کے عہد کی زبان پر عربیت زیادہ غالب تھی۔ اِن دونوں کی زبان کا فرق دکھانے کے لیے میں ذیل کی مثال پیش کرتا ہوں۔ شاہ نامہ ؎

ازیں راز جانِ تو آگاہ نیست　　درین پردہ اندر ترا راہ نیست

(جلد اوّل ص۵۹ تمہید۔ داستانِ سہراب)

زلیخا۔ کس از سرِّ ایں حکمت آگاہ نیست　　درین پردہ مخلوق را راہ نیست (ص۱۵۱)

صاحبِ زلیخا نے اپنے زمانے کے مذاق کے مطابق عربی الفاظ لاکر فردوسی کی زبان کی کہنگی کو برطرف کر دیا۔ اور شعر پر اپنا قبضہ کر لیا۔

شاہ نامہ پر ایک سرسری نظر

اس وقت تک تصویر کا ایک پہلو معائنہ کیا گیا ہو۔ تصویر کے دوسرے پہلو کے بغیر ہماری تحقیقات کا پورا مرحلہ طے نہیں ہو سکتا۔ زلیخا کے بعد ضروری ہوا کہ شاہ نامہ پر بھی ایک نگاہ ڈالی جائے۔ اس مثنوی کا سرسری مشاہدہ اس علم کے لیے کافی ہو کہ مصنّف یوسف زلیخا، فردوسی کے ایسے کلمات اور فقرات سے جو شاہ نامہ میں روزمرّہ کا حکم رکھتے ہیں اور فردوسی جن کی تکرار سے تھکتا نظر نہیں آتا، یوسف زلیخا کے دوران میں بالکل اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں ایسے سینکڑوں کلمات سے بخوفِ طوالت صرف چند نمونوں پر اکتفا کی جاتی ہو۔

ابی۔ کلمۂ نفی بمعنی بی۔ امثال از شاہ نامہ ؎

ابی آن کہ بد ایچ بیمارئے (۱)　　نہ از دردہا ہیچ آزارئے (ص۴۸ جلد اوّل)

ہمہ چین بروز ارد گریان شدند (۲)　　ابی آتش از درد بریان شدند (ص۹۶ جلد چہارم)

شاہ نامہ میں اگرچہ عموماً مستعمل ہو زلیخا سے قطعاً خارج کر دیا گیا ہو۔ اسدی ؎

اے آفتابا ترا چیست حال چنین تیرہ شب دل گرفتم ملال
(گرشاسپ نامہ ص۶ طبع آقا محمد شیرازی بمبئی)

ایدون ۔ بمعنی اکنون وچنین، شاہ نامہ ؎

سرِ بانوانی وہم مہتری (۱) من ایدون گمانم کہ تو مادری (ص۱۰۵، جلد اوّل
من ایدون شنیدم کہ جائے مہی (۲) ہمی مردمِ ناسزارا دہی (ص۱۱۳، جلد چہارم

یہ لفظ بھی زلیخا سے غیر حاضر ہی اور اسدی کے ہاں موجود ہی ؎

من ایدون ز طبعم بہار آورم مرایں شاخ رانو ببار آورم (ص۱۱، گرشاسپ نامہ

چنان چون ۔ یہ ترکیب قدما کے ہاں اکثر رائج ہی۔ دقیقی ؎

نوشتم من ایں نامۂ شاہوار چنان چون بود درخورِ شہریار
(شاہ نامہ ص۲ جلد سوم)

فردوسی (۱) بیامد ز بازار مردے ہزار چنان چون نہ زیبندۂ کارزار
(شاہ نامہ ص۱۳ جلد سوم)

ایضاً (۲) چنان چون بدم کہترِ کیقباد کنون از تو دارم دل ومغز شاد
(شاہ نامہ ص۳۲ جلد سوم)

اسدی ؎ ز دل برکشد می تفِ درد وتاب چنان چوں بخار از زمین آفتاب
(ص۱۵ گرشاسپ نامہ)

زلیخا میں متروک ہی۔

تفت ۔ بمعنی گرم۔ شاہ نامہ میں عام طور پر ملتا ہی۔ امثال ؎

(۱) سپہ بد بدژ روے بنہاد تفت بکردار بازارگانان برفت
(شاہ نامہ جلد سوم ص۲۳)

(۲) مقاتورہ ازپیش خاقان برفت بیامد سوے خرگہ خویش تفت (شاہنامہ جلد چہارم ص۴۴)

اسدی ؎ وزآن جا سپہ راند و بشتافت تفت   بشادی بشہرے زسنجاب رفت
(گرشاسپ نامہ ص ۵۹)

زلیخا میں رائج نہیں۔

یارمند۔ شاہ نامہ میں عام طور پر ملتا ہے۔ امثال ؎

(۱) بدارندۂ آفتاب بلند   کہ باشم شمارا بدو یارمند
(شاہ نامہ۔ جلد چہارم ص ۴۳)

(۲) نخواہم کہ آید شمارا گزند   مباشید با من بہ بد یارمند
(ص ۱۲۳) جلد چہارم

اسدی ؎ بود کاخترت یارمندی کند   ہمہ دشمنت دل نژندی کند
(ملحقاتِ شاہ نامہ ص ۹)

گمانیدن۔ امثال از شاہ نامہ ؎

گمانند کیں بیشہ پر خون شود (۱) ز دشمن زمین رود جیحون شود (ص ۱۲۱) جلد چہارم

ازان کو ہم آواز و ہم کیش اوست (۲) گمانم کہ قیصر بتن خویش اوست (ص ۱) ،،

اسدی ؎ زرستم ہمی چونکہ خواہی شنود   گمانی کہ چون او بمردی نبود
(گرشاسپ نامہ ص ۱۰)

زلیخا میں نظر نہیں آتا۔

گرایدونکہ۔ قدما کے ہاں یہ ترکیب مستعمل ہے۔ دقیقی ؎

گرایدونکہ بپذیر داو پند ما   نسایدہمی پائے او بند ما
(شاہ نامہ جلد سوم ص ۴)

فردوسی ؎ گرایدونکہ از دشت نیزہ وران   بنالد کسے از کران تا کران
(شاہ نامہ جلد چہارم ص ۵)

(۲) گر ایدونکہ بازآرد آن راکہ گفت گناہ گزشتہ بباید نہفت

(شاہ نامہ جلد دوم ص ۱۹۰)

زلیخا میں مہجور الاستعمال معلوم ہوتا ہے۔

ور ایدونکہ۔ زلیخا میں سکۂ غیر رائج ہے۔ دقیقی ؎

ور ایدونکہ نپذیری این پندِ من بسائی گران آہنیں بندِ من

(شاہ نامہ، جلد سوم ص ۲)

فردوسی ؎ ور ایدونکہ زین کار ہستم گناہ جہان آفریند ندارد نگاہ

(شاہ نامہ جلد اوّل ص ۱۰۷)

(۲) ور ایدونکہ پیران کند دست پیش بخواہد سپہ یا ور از شاہِ خویش

(شاہ نامہ جلد دوم ص ۱۲۸)

ار ایدونکہ قدما اکثر یہ ترکیب استعمال میں لاتے ہیں۔ دقیقی ؎

ار ایدونکہ بپذیری ابن نیک پند زترکان بجانت نیاید گزند

(شاہ نامہ جلد سوم ص ۴)

فردوسی ؎

بدو گفت ار ایدونکہ کین نیا نجوئی نداری بدل کیمیا

(شاہ نامہ جلد سوم ص ۱۵)

(۲) ار ایدونکہ پیران نخواہد نبرد بانبوہ لشکر بیارد چو گرد

(شاہ نامہ جلد دوم ص ۲۳۵)

زلیخا میں نامعلوم ہے۔

بر آنہم نشان ۔یعنی ہماں طور، شاہ نامہ میں یہ ترکیب کثرت سے ملتی ہے زلیخا میں نہیں ملتی۔ شاہ نامہ ؎

بریزند خونش . برآنہم نشان (۱) کہ اور یخت خون سرِ سرکشان (ص۵۷) جلد چہارم

برآن ہم نشان تا قبادِ بزرگ (۲) کہ از داد او میش شد خویش گرگ (ص۳۰) "

تنگ اندر آمدن ۔ نزدیک آمدن، بالعموم شاہ نامہ میں آتا ہے۔ شاہ نامہ ؎

چو جاماسپ تنگ اندر آمد زراہ (۱) ورا باز دانست فرزند شاہ (ص۲۴ جلد سوم)

دو لشکر چو تنگ اندر آمد زراہ (۲) از انسو سپہدار ازین سوے شاہ (ص۲۶ جلد چہارم)

مثنوی یوسف زلیخا میں یہی مقصد یوں ادا ہوا ہے ؎

شدم تا بہ نزدیک آن شہر تنگ (۱) کہ ناگہ برآمد یکے بوے ورنگ (ص۱۰۶)

بہ گفت این و تنگ اندرون شد برش (۲) کہ بوسہ رباید ز دو شکّرش (ص۱۰۹)

فرمان کردن ۔ اطاعت کردن ۔ شاہ نامہ میں کثرت کے ساتھ آتا ہے۔ امثال ؎

چنین داد پاسخ کہ فرمان کنم (۱) بدین آرزو جان گروگان کنم (ص۲۸۳) جلد دوم

اگر باز خواہی تو فرمان کنیم (۲) بنوے یکے تازہ پیمان کنیم (ص۵۳) جلد سوم

زلیخا میں غیر مستعمل ہے۔

بزار ۔ ای بزاری۔ شاہ نامہ میں آتا ہے۔ امثال ؎

خروشے برآمد ز ایران بزار (۱) جہان شد پر از نام اسفندیار (ص۴۴) جلد سوم

کہ بگریستی بر مسیحا بزار (۲) دو رُخ سرخ و مژگان چو ابر بہار (ص۷۹) جلد چہارم

زلیخا میں معدومیت کا حکم رکھتا ہے۔

کیمیا ۔ حیلہ و تدبیر ۔ شاہ نامہ میں عموماً نظر آتا ہے۔ امثال ؎

یکے آن کہ گفتی کہ کینِ نیا (۱) بجستم من از چارہ و کیمیا (ص۲۶) جلد سوم

بزین اندر افگند گرزِ نیا (۲) پر از جنگ سر دل پر از کیمیا (ص۲۱۲) جلد دوم

زلیخا اس لفظ سے واقف نہیں۔

پیران سر - ای پیرانہ سر- شاہ نامہ- امثال ؎

نگر باز گردد ز بد نامِ من (۱) بہ پیران سراین بد سرانجامِ من (ص۲۱۳) جلد دوم
نہ بینی گزین بے ہنر دخترم (۲) چہ رسوائی آمد بہ پیران سرم (ص۲۰۹) " "

دست بکش کردن - ای دست بر سینہ نہادن- شاہ نامہ میں عموماً آتا ہی- امثال ؎

بکاخ اندرون شد پرستاروش (۱) بر شاہ بر دست کردہ بہ کش (ص۲۰۹) جلد دوم
بہ فرمود تا النبک آب کش (۲) بر شاہ بر دست کردہ بہ کش (ص۱۱۴) جلد سوم

زلیخا میں نایاب ہی-

گروگان کردن - ای گرو کردن، بالعموم شاہ نامہ میں ملتا ہی اور زلیخا میں نادر ہی- امثال از شاہ نامہ ؎

شماد ادجوئید و فرمان کنید (۱) روان را بہ پیمان گروگان کنید (ص۶۰) جلد سوم
ہمہ بیش تو جان گروگان کنیم (۲) ز دیدار تو رامش جان کنیم (ص۱۶) " "

بادگشتن - شاہ نامہ میں عموماً نظر آتا ہی اور زلیخا میں نہیں ملتا- امثال ؎

کنون آنچہ بد بود بر ما گزشت (۱) گزشتہ ہمہ نزدِ من باد گشت (ص۱۶) جلد سوم
بدار اب گفت آنچہ اندر گزشت (۲) چنان دان کہ یکسر ہمہ باد گشت (ص۵۳) " "

باد در مشت یا بدست ماندن - شاہ نامہ کا عام محاورہ ہی- امثال ؎

کہ مارا کنون جان باسپ اندر است (۱) چو سستی کند باد ماند بدست (ص۵۶ جلد سوم)
سپاہ اندر آید پس پشتِ من (۲) نماند بجز باد در مشتِ من (ص۲۲۲ جلد دوم)
بہ گیرند گردن کشان پشتِ اوے (۳) نماند بجز باد در مشتِ اوے (ص۲۲۹ " ")
بدین شہر درویشی و رنج ہست (۴) ازین بگزری باد ماند بدست (ص۷۶ جلد سوم)

زلیخا میں معدوم ہے۔

ہوش باز آوردن ۔ زلیخا میں نظر نہیں آتا۔ شاہ نامہ سے

چنیں داد پاسخ کہ باز آر ہوش (۱) کہ من پور قیدافہ ام قیدروش (ص ۶۷) جلد سوم

بدو گفت گرگین کہ باز آر ہوش (۲) سخن بشنو و پہن بکشائے گوش (ص ۲۱۰) جلد دوم

کام گرّی خاریدن ۔ شاہ نامہ میں دیکھا جاتا ہے اور زلیخا ناواقف ہے۔ امثال سے

بجان انشبے دادمت زینہار (۱) بایوان رسی کام گرّی مخار (ص ۳۹) جلد سوم

چنین گفت با شاہزادہ تخوار (۲) کہ با مردمی کام گرّی مخار (ص ۱۰۹) جلد چہارم

آب از تارک بر تر گزشتن ۔ شاہ نامہ سے

ز تارک مرا آب برتر گزشت (۱) غم و شادمانی ہمہ بادگشت (ص ۹۶) جلد چہارم

سپہ را ز کوشش سخن در گزشت (۲) ز تارک دم آب برتر گزشت (ص ۵۷) جلد سوم

کسے را بکس نداشتن ۔ شاہ نامہ سے

بگیتی ندارد کسے را بکس (۱) تو گوئی کہ نوشیروان ست و بس (ص ۱۷) جلد چہارم

ندارد ز شاہان کسے را بکس چہ کہتر چہ از شاہ فریادرس (ص ۴۱) رر

کس بکس نشمردن ۔ شاہ نامہ سے

ز مردی و گردی بمانند گرید (۱) ازین مرز کس را بکس نشمرید (ص ۱۲۸) جلد سوم

ز دیدار من گوے بیروں برد (۲) ازین انجمن کس بکس نشمرد

زلیخا میں عنقا ہے۔

بیدار دل باش و روشن رواں ایک قسم کی دعا ہے جو شاہ نامہ میں اکثر آتی ہے۔ امثال سے

سپہ آفرین خواند بر پہلوان (۱) کہ بیدار دل باش و روشن روان (ص ۱۸۱) جلد دوم

چنین داد پاسخ بدو پہلوان (۲) کہ بیدار دل باش و روشن روان (ص ۱۰۹) جلد دوم
زلیخا میں نامعلوم ہی۔

کلید و بند۔ اِن کی ترکیب سے شاہ نامہ میں کئی محاورے بنائے گئے ہیں۔ امثال ؎

خبر چوں بہ نزدیک توران رسید (۱) مرآن بند را ساختہ شد کلید (ص ۱۰۹) جلد اول
ستم بر سیاوش ازیشان رسید (۲) کہ زو آمد این بند بد را کلید (ص ۱۸۷) جلد دوم
بسے بر نیامد کہ پاسخ رسید (۳) یکے نامہ بد بند او را کلید (ص ۲۶) ؍؍
منوچہر ازان تخمہ آمد پدید (۴) شد آن بند ہا را سراسر کلید (ص ۱۲۶) جلد چہارم

زلیخا میں مطلق غیر حاضر ہی۔ نظامی کے ہاں بند کے بجائے قفل آتا ہی۔

آب و جوی۔ اِن کی ترکیب سے شاہ نامہ میں کئی محاورے ملتے ہیں۔ امثال ؎

بمنذر چنیں گفت بہرام گور (۱) کہ اکنون کہ شد آب در جوی شور (ص ۱۰۹) جلد سوم
یکے چارہ سازم کہ بدگوے من (۲) نراند بزشت آب در جوی من (ص ۸۶) ؍؍
چنیں گفت رستم کہ ایں روے نیست (۳) رہ آب گردان بدین جوے نیست (ص ۲۰) جلد دوم
ہمہ زین شمارند و این روے نیست (۴) مراین آب اندر جہاں جوے نیست (ص ۱۸۹) ؍؍

بادِ سرد از جگر گشیدن فردوسی شاہ نامہ میں اس محاورے کا بہت مشتاق معلوم ہوتا ہی اور بار بار اس کو دہراتا ہی اور تکرار سے تھکتا نظر نہیں آتا۔ مَیں صرف چند امثال پر قناعت کرتا ہوں حیرت ہی کہ فردوسی کا نہایت مقبول محاورہ زلیخا سے بالکل متروک ہی۔ شاہ نامہ ؎

چو پیغام گرگین بر رستم رسید (۱) یکے بادِ سرد از جگر بر کشید (ص ۲۱۳) جلد دوم
یکے بادِ سرد از جگر بر کشید (۲) بسوئے گلہ دار قیصر کشید (ص ۲۸) ؍؍

بدو داد پس گنجہا را کلید (۳) یکے باد سرد از جگر برکشید (ص ۴۹) جلد سوم
چو رومی سرِ تاج کسریٰ بدید (۴) یکے باد سرد از جگر برکشید (ص ۴۲) جلد چہارم

محاکمہ تصویر کے دونوں پہلو امتحان کرنے اور گزشتہ بیانات کو ذہن میں رکھنے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ نامہ اور یوسف زلیخا کی زبان میں وہ فرقِ بیّن موجود ہے جو کسی صورت میں ایک ہی وقت کے دو معاصرین کی زبان میں تصوّر نہیں کیا جا سکتا چہ جائے کہ ایک ہی مصنف کی زبان میں خیال کیا جائے۔ اِس لیے ہم مجبوؔر ہیں کہ ان کو دو شخص مانیں اور وہ بھی ایسے جو مختلف العصر اور مختلف الوطن ہوں۔ ہمارے وجوہ حسب ذیل ہیں :۔

(۱) دونوں مثنویوں کے مخصوصی خط و خال جو ایک مصنف کی جملہ تصنیفات کے عام جوہر ہونے چاہییں باہم مشترک نہیں مثلاً ابی۔ ایدون۔ گرایدونکہ۔ ورایدونکہ۔ کیمیا۔ پیران سر۔ برآن ہم نشان۔ بزار۔ گروگان کردن۔ باد در مشت ماندن۔ کس بکس شمردن۔ بادِ سرد از جگر کشیدن۔ وغیرہ وغیرہ جن سے شاہ نامہ کے دوران میں علی التواتر ہم روشناس ہوتے رہتے ہیں، زلیخا میں ابتدا ہی سے نامعلوم ہیں۔ علیٰ ہذا زلیخا کے ایسے الفاظ مثلاً نکوئی۔ خوار بار۔ جلدی۔ ہمزاد۔ غریو و غرنگ۔ بند و کشائے وغیرہ وغیرہ شاہ نامہ میں ایک نامعلوم کمیت کا حکم رکھتے ہیں۔

(۲) بعض مفرّس الفاظ مثلاً ملکت۔ عفو۔ لطف۔ یشوم۔ عمداً۔ عماری مشاطہ کی ترویج بظاہر سلجوقی عہد میں ہوئی ہے اسی لیے اس دور کے شعرا میں ان کا رواج زیادہ پایا جاتا ہے۔ یعنی منوچہری۔ ناصر خسرو۔ اسدی۔ امیر معزّی۔ مسعود سعد سلمان۔ عثمان مختاری۔ حکیم سنائی۔ عمعق بخاری۔

ادیب صابر وغیرہ - فردوسی جیسا کہ گزشتہ سطور میں دیکھا جا چکا ہے ان الفاظ کے لیے کم سے کم قاعدۂ تفریس سے بالکل بے خبر ہے اور جب زلیخا میں ان کا رواج ہے تو بدیہی ہے کہ یہ کتاب سلجوقی دور میں کسی وقت لکھی گئی ہوگی -

(۳) بعض محاورے مثلاً گوش داشتن، گرہ برزدن جب کہ فردوسی کے ہاں اکثر لغوی معنوں میں آتے ہیں مثنوی یوسف زلیخا میں کنایات کا درجہ حاصل کر کے کچھ اور ہی مفہوم ادا کرتے ہیں اور یہ بات ایک عہد میں حاصل نہیں ہو سکتی -

(۴) بعض محاورے جو زلیخا میں بالعموم نظر سے گزرتے ہیں فردوسی ان سے واقف معلوم نہیں ہوتا مثلاً صورت بستن - عتاب برداشتن - دل برگماردن - گرمی نمودن - گمان زدن وغیرہ، ان کی صورت کہ رہی ہے کہ ہماری ولادت فردوسی کے عہد سے بہت عرصے بعد ظہور میں آئی جب کہ تکلّف اور رنگینی زبان میں شائع ہو چکی تھی -

(۵) بعض الفاظ جب کہ شاہ نامہ میں رائج ہیں، زلیخا میں مہجور الاستعمال معلوم ہوتے ہیں اور ان کے بجائے اور لفظ لائے گئے ہیں مثلاً بویژہ اور ویژگان شاہ نامہ میں ملتے ہیں اور زلیخا میں پہلے لفظ کے بجائے بخاصہ آتا ہے۔ شاہ نامہ کے بند بستن کے بجائے زلیخا میں عقد بستن ملتا ہے - شاہ نامہ کے بادِ سرد کا قائم مقام زلیخا میں آہ ہے اور شاہ نامہ کے گزاریدن خواب کے بدلے زلیخا میں تعبیر ملتا ہے - اِن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ نامہ اور زلیخا کی زبانوں میں بہت فرق ہے - اگر شاہ نامہ فردوسی کی زبان کا معیار صحیح ہے تو زلیخا فردوسی کے قلم سے ہرگز ہرگز نہیں لکھی گئی - کیونکہ فردوسی

کے لیے یہ خیال کرنا کہ جب وہ آفتاب لبِ بام اور پا بلب گور ہو رہا تھا
اُس وقت اپنی تازہ تصنیف زلیخا کے لیے نیا اسلوب نئی اصطلاحات اور
نئے معانی ایجاد کر رہا تھا ایک ناممکن اور محال عقیدہ ہے۔

(۶) دونوں اساتذہ کی وطنیت میں بھی اختلاف ضرور پایا جاتا ہے۔
ہمارے پاس اس خیال کے موید یہ قرائن ہیں۔فردوسی شاہ نامہ میں
ساربان کو ہمیشہ ساروان لکھتا ہے۔ زلیخا میں ساربان آتا ہے۔اب ساربان
اور ساروان ایک ہی خطۂ ملک میں نہیں بولے جا سکتے۔علیٰ ہذا ارج
اور ورج ایک ہی شہر میں نہیں بولے جائیں گے، جس وطن میں خرید و فروخت
بولنے کے عادی ہیں وہاں خرید و فروش رائج نہیں ہو گا۔ جس شہر
میں کاریگر معمار کے معنی دیتا ہے وہاں یہ لفظ ملازم کے معنی نہیں دے
سکتا۔جس وطن میں آذین بستن عوام میں بولا جاتا ہے وہ آئین بستن نہیں
کہیں گے اور غریویدن جہاں شور اور فریاد کے معنوں میں مستعمل ہے
وہاں اس کو گریہ و زاری کے معنوں میں نہیں بولیں گے۔علیٰ ہذا پرس
اور پرسش ایک جگہ نہیں بولے جا سکتے۔اسی طرح پوشیدن بجائے
پوشانیدن پرہیزیدن بجائے پرہیزانیدن اور شنیدن بجائے شنوانیدن
ایک وطن کی بولیاں نہیں۔ اگر فردوسی کے وطن میں یہ الفاظ جو
زلیخا میں ملتے ہیں بولے جاتے تھے تو فردوسی شاہ نامہ میں اِن کو ضرور
لاتا اور یہ ما بہ الامتیاز فرق دونوں تصنیفات میں نہ پایا جاتا۔لیکن اس
فرق کی موجودگی دلیل ہے اس امر کی کہ دونوں اساتذہ کی وطنیت میں
اختلاف ہے۔

(۷) بعض محاورے اور الفاظ جب کہ دونوں مثنویوں میں مشترک

ہیں اُن میں یہ امتیاز دیکھا جاتا ہے کہ زلیخا میں جب کہ وہ روز مرہ بن گئے ہیں شاہ نامہ میں من قبیل شاذ لائے گئے ہیں۔ مثلاً گوش داشتن۔ تخت زدن۔ ہمزاد۔ قضارا۔ اُستوار وغیرہ۔ اس سے یہی عقیدہ مستنبط ہوتا ہے کہ دونوں استاد مختلف العہد ہیں۔

(۸) بعض امثال کے ذریعے سے دکھایا جا چکا ہے کہ فردوسی جس حالت میں کہ ادائے مطالب کے لیے ایک محدود میدان میں کدو کاوش اور تگ ودو کرتا نظر آتا ہے۔ صاحب زلیخا ایک فضائے بسیط پر قابض اور متصرف معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہی احتمال ہوتا ہے کہ دونوں شاعروں کو ایک مدت دراز ایک دوسرے سے جُدا کر رہی ہے اور فارسی زبان اس عرصے میں ترقی کر کے بہت کچھ وسیع ہو چکی ہے۔

(۹) فردوسی اور صاحب زلیخا کو ایک دوسرے سے تمیز کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک دلیل یہ بھی ہے کہ دونوں اساتذہ کی معلومات میں فرق ہے۔ فردوسی ارژنگ کو جادو نیرنگ اور تصویر کے معنوں میں لاتا ہے اور یہ معنی ایسے ہیں جن سے صاحب زلیخا واقف تک نہیں۔ یہ بہت غیر مشہور معنی ہیں، اور دیگر اساتذہ بھی عام طور پر نہیں جانتے۔ شاہ نامہ میں ارژنگ پانچ موقعوں پر تصویر کے معنوں میں آیا ہے۔ اس تکرار سے ظاہر ہے کہ فردوسی کے نزدیک یہی معنی تھے۔ وضاحت کے خیال سے "ارژنگ چین" بھی لکھ دیا ہے۔ تاکہ کسی کو مانی کی ارژنگ کا دھوکا نہ ہو۔ فردوسی اگر یوسف زلیخا لکھتا تو کیا وجہ ہے کہ وہ اپنے معلومہ معنی زلیخا میں ارژنگ کو نہ دیتا۔ زلیخا میں "ارژنگ مانی" چار مقام پر آیا ہے اور ہر مقام پر مانی کی کتاب یا مانی کے نگارخانہ کے

معنی دیتا ہو۔لیکن شاہ نامہ والے معنی کبھی بھول کر بھی نہیں آتے۔ کیا بقول شاعر ؎

پس از سی سال این معنی محقق شد بخاقانی
کہ بورانی ست بادنجان و بادنجان بورانی

فردوسی کو اسّی برس کی عمر کے بعد زلیخا تصنیف کرتے وقت محقق ہوُا کہ ارژنگ مانی کی کتاب کا نام ہو نہ تصویر اور نیرنگ جو معنی اس نے شاہ نامہ میں دکھلائے ہیں۔لیکن حقیقت یہ ہو کہ فردوسی مانی کی تاریخ سے واقف ہونے کی بنا پر مانی کی کتاب ارژنگ کے وجود کا قائل نہیں تھا اسی لیے شاہ نامہ میں اس کا ذکر نہیں کرتا اور اگر زلیخا لکھتا تو اس میں بھی اس قسم کی غلطی کے ارتکاب سے پرہیز کرتا۔

(۱۰) یہاں کچھ منٹ کے لیے میں اپنے مبحث اصلی سے اعراض کر کے چند الفاظ ایک نئے مضمون کے متعلق کہنا چاہتا ہوں۔اس سے میرا مقصد اسدی اور اس کا گرشاسپ نامہ ہو۔اسدی کے متعلق ہمارے ہاں بہت کچھ غلط بیانیاں رائج ہیں۔اکثر اس کو فردوسی کا استاد مانتے ہیں۔نیز شاہ نامہ داستان یزدگرد خاتم تاجداران عجم سے خاتمہ تک اسدی کا نظم کردہ بتایا جاتا ہو لیکن یہ ناقابلِ تسلیم قصّہ ہو۔حقیقت یہ ہو کہ شاہ نامہ اور گرشاسپ نامہ میں پورے اٹھاون سال کا تفاوت ہو۔گرشاسپ نامہ ۴۵۸ھ ہجری میں تصنیف ہوُا چنانچہ گرشاسپ نامہ ؎

زہجرت بدورِ سپہری کہ گشت
شدہ چار صد سال و پنجاہ و ہشت

گرشاسپ نامہ کا عہد معلوم کر کے سب سے پہلے ہمیں یہ تحقیق کرنا

ہے کہ آیا بحیثیتِ عمر گرشاسپ نامہ متقدم ہے یا مثنوی یوسف زلیخا۔
گرشاسپ نامہ اور مثنوی یوسف زلیخا میں بعض الفاظ اور محاورے
عام ہیں مثلاً از آدم دروں تا الخ تخت زدن۔ کِلّہ زدن۔ قضارا۔ مشاطہ۔
غریو و غرنگ۔ اب یہ الفاظ زلیخا گرشاسپ نامہ سے لے رہی ہے یا
گرشاسپ نامہ زلیخا سے، اس کا تصفیہ یوں ممکن ہے کہ "قضارا" زلیخا
میں اس کی مکمل شکل میں ملتا ہے جیسے بوستاں میں لیکن گرشاسپ نامہ
میں وہ محض قضا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ "قضا" اور "قضارا" میں قضا زیادہ
قدیم ہے اسی طرح "بویژہ" شاہ نامہ اور گرشاسپ نامہ میں عام ہے
لیکن زلیخا میں متروک ہے اور اس کا قائم مقام "بخاصہ" لایا گیا ہے۔
ان میں ظاہر ہے کہ "بویژہ" قدیم ہے اور "بخاصہ" جدید۔ اس استدلال سے
یہ قرینہ برآمد ہوتا ہے کہ زلیخا گرشاسپ نامہ کے بعد کی تصنیف ہے لیکن
اس قیاس کو درجۂ یقین تک ارتقا دینے کے لیے ہمیں شاہ نامہ کی
طرف رجوع کرنا چاہیے ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ نامہ اور گرشاسپ نامہ
میں ایسے الفاظ مثلاً ابی۔ ایدون بویژہ۔ چنانچوں تفت۔ یارستن۔
گمانیدن وغیرہ عام ہیں لیکن یہی الفاظ مثنوی یوسف و زلیخا میں
مہجور الاستعمال ہیں۔ اگر زلیخا گرشاسپ نامہ سے متقدم ہوتی تو یہ
الفاظ اس میں قطعی پائے جاتے، چونکہ زلیخا میں موجود نہیں اس سے
یہی قابل پذیرائی نظریہ قائم کیا جا سکتا ہے کہ اگرچہ گرشاسپ نامہ کے
دور میں رائج تھے لیکن زلیخا کے عہد میں متروک مانے جا کر آرائشِ
طاقِ نسیاں بنا دیے گئے تھے اس سے زلیخا پر گرشاسپ نامہ کا
تقدم ثابت ہوتا ہے۔ جب گرشاسپ نامہ کا تقدم ثابت ہو گیا تو شاہ نامہ

کا تقدم خود بخود ظاہر ہی کیونکہ شاہ نامہ تو اسدی کی تصنیف سے پورے اٹھاون سال بڑا ہی۔

(۱۱) ہم دیکھتے ہیں کہ فردوسی کے محاورے اور روزمرّہ کے بیسیوں کیا بلکہ سینکڑوں الفاظ صاحب یوسف وزلیخا کے نزدیک مہجور الاستعمال ہیں اور یہ ہمیں ماننا ہوگا کہ سینکڑوں کی تعداد میں الفاظ اور کلمات ایک قلیل مدّت یا مہلت میں قلمروِ زبان سے اخراج نہیں پا سکتے۔ کیونکہ زبان کسی ایک شخص کی مِلک نہیں وہ تمام قوم اور ملک کی زبان ہی اور یہ ہم جانتے ہیں کہ جب تک تمام قوم کسی کلمے یا لفظ کو اپنی گفتگو سے خارج کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے وہ کلمہ ترک نہیں ہو سکتا۔ ہزاروں بشر ایک دم میں قتل اور ہلاک کیے جا سکتے ہیں اور لاکھوں نفوس چند لمحوں میں صفحہ ہستی سے محو کیے جا سکتے ہیں لیکن الفاظ کا قتلِ عام اس طرح عمل میں نہیں لایا جا سکتا اِن کی اگر موت ہوتی ہی تو اکثر طَبعی ہُوا کرتی ہی جب کہ ملک کو ان کی ضرورت نہیں رہتی اور ان سے بہتر جانشین اور قائم مقام پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً فردوسی کا "خورشید چوں تواں نہفتن" اسدی کے ہاں "خورشید بگل نتواں پوشیدن" بنا اور یوسف زلیخا میں "شمس بگل اندودہ داشتن" بن کر لباب الالباب میں "چشمۂ آفتاب بگل اندودن" بن گیا۔ وقس علیٰ ذالک۔ فردوسی کی ضرب الامثال "بفردا عماں کارِ امروز را" اور "آب از تارک برتر گزشتن" اِصلاح پاکر موجودہ شکل میں "کارِ امروز بفردا مگزار" اور "آب از سر گزشتن" بن گئے۔

مختصر یہ کہ الفاظ اور محاورات کا روزمرّہ سے اخراج ایک دور و دراز عمل ہی اور یہ عمل عمروں میں ختم ہوتا ہی سینکڑوں کلمات اور محاورات

کا اقلیم زبان سے اخراج اور اس کا عمل دس بیس پچاس سال کا کام نہیں ہر بلکہ صدیوں کا۔ اِس سے میرا مقصد شاہ نامہ اور یوسف زلیخا کے زمانوں کی طرف ایما کرنا ہر جن کے درمیان میں میری رائے میں کم و بیش ایک اور نصف صدی کا فاصلہ حائل ہر۔

زلیخا کے عصرِ تصنیف کو ایک خاص مدت میں حصر کرنے کے لیے میرے پاس دو قرینے ہیں پہلا گرشاسپ نامۂ اسدی ۴۵۸ھ اور یہ پیشتر دکھایا جا چکا ہر کہ زلیخا بہ لحاظ عصر گرشاسپ نامہ سے متاخر ہر دوسرے سکندر نامۂ مولانا نظامی گنجوی جو ۵۹۷ھ ہجری میں تصنیف ہوا ہر ؎

بتاریخ پانصد نود ہفت سال

کہ خوانندہ راز و بگیرو ملال

سکندر نامہ اور زلیخا میں مادۂ فارق کی جستجو کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ زلیخا کے ایسے الفاظ مثلاً "ابا" بمعنی با۔ "ابر" بمعنی بر۔ "کجا" (بالکسر) (اُردو میں جس کے معنی جو۔ جب۔ جہاں۔ اور جیسے ہوں گے) خوانا ندند، راندند اور افشاندند۔ (جن کے پڑھتے وقت پہلا نون بضرورتِ شعری پورا ظاہر کرنا ہوگا قدما میں یہ رواج بہت عام تھا مثلاً انوری ؎

اختراں را شوکتت بر سمت طاعت راندہ

آسماں را نعمتت در زیرِ فرماں یافتہ

اس میں راندہ کا نون بضرورتِ وزن پورا ظاہر کرنا ہوگا) سکندر نامہ میں یک قلم متروک ہیں۔ اگرچہ یہ کلمات زلیخا کے عہد میں بھی آفتاب لبِ بام کا حکم رکھتے ہیں کیونکہ دیکھا جاتا ہر۔ زلیخا میں وہ بہت کمی کے ساتھ آتے ہیں مثلاً کجا صرف پانچ مقام پر ملتا ہر اور خواندند وغیرہ صرف دو

موقعوں پر ملتے ہیں۔ اس سے یہی قیاس کیا جاتا ہی کہ زلیخا کے ایامِ تصنیف ہی میں متروک ہو چلے تھے۔ آمدم بر سرِ قصّہ جب یہ الفاظ زلیخا میں موجود ہیں اور سکندر نامہ میں غیر حاضر تو ظاہر ہی کہ سکندر نامہ زلیخا سے بعد کی تصنیف ہی اور زلیخا کا عصر سکندر نامہ سے مقدم ہی۔ اس طرح قرنِ ششم کے منتصفِ اوّل میں زلیخا کی تصنیف کے واسطے ہماری نگاہ جمتی ہی۔

حدیقۂ حکیم سنائیؒ جو ۵۲۴ھ و ۵۳۵ھ کے درمیان لکھا گیا ہی چنانچہ حدیقہ ؎

پانصد و بست و چار رفتہ ز عام
پانصد و سی و پنج گشتہ تمام

اگرچہ بعض آثار اور علامات سے پایا جاتا ہی کہ وہ زلیخا کے ہم عہد ہی لیکن بعض خط و خال اس قسم کے ہیں جو حدیقہ پر زلیخا کے تقدم کو ثابت کرتے ہیں۔ مگر اس سے میرا اسی قدر مقصد ہی کہ قرنِ سادس کا منتصفِ اول زلیخا کی ولادت کا بہتر زمانہ ہو سکتا ہی۔ انہی ایّام میں زلیخا کی تصنیف منضبط کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک اور قرینہ ہی اور وہ یہ ہی کہ :-

علاوہ اور اسالیبِ ایامی کے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہی زلیخا کی ایک خصوصیت یہ بھی ہی کہ جب افعال معطوف و معطوف علیہ آتے ہیں فعل معطوف علیہ عام اس سے کہ واحد ہو یا جمع۔ غائب ہو یا حاضر یا متکلم فعل معطوف بصیغۂ واحد غائب لایا جائے گا۔ امثال ؎

شعر
قبا بست و چابک نوردیدہ دست
قبایش درید نار و دستش شکست
(بوستانِ سعدیؒ ۶۵۵ھ)

اس مثال میں دریدند کی تبعیت میں شکستند لایا جاتا۔

مثالِ دیگر

"اسعاف ملتمس او را رحمہ اللہ لازم شمردم و اجابت دعوتش فریضہ دانست"
(المعجم فی معاییر اشعار العجم من شمس الدین محمد بن قیس ۶۱۴ھ) (اس مثال
میں فریضہ دانستم آنا چاہیے تھا)

مثالِ دیگر

زندہ شد مردمیِ حاتم و مردی رستم
چوں بہ بزم اندر نشستی و برزم اندر خاست

لطیف الدین زکی مراغۂ در مدح معزالدین سنجر حسین بن علی۔ (لباب، باب یازدہم ص ۳۰۶)
اس مثال میں خاستی ہوتا۔

مثالِ دیگر

از پاے در فتادم و از دست شد کہ چشم
روزے نہ دید از تو مراعات سرسری

محمد بن علی الکاشانی (لباب، باب ہفتم ص ۱۸۲) اِس مثال میں از دست شدم آتا۔

مثالِ دیگر

دادی بوصلِ وعدہ و انگہ بطنز گفت
چیزے کہ کس نیافت تو از من مدار چشم

جمال الدین الازہری المروزی (لباب فصل دوم از باب ہفتم ص ۲۱۵) اس
مثال میں گفتی موزوں تھا۔

مثالِ دیگر

"و یکے از لطافتِ طبعِ او آن بود کہ مطائباتی کہ در حقِ او گفتہ بودند
یاد داشتی و حکایت کردے" محمد عوفی۔ (لباب الالباب۔ باب یازدہم ص ۳۹۳)۔

یہاں حکایت کردی درست تھا۔

مثالِ دیگر

"آں اسیران را اگر برین جملہ کہ فرمودیم با وطان و بلاد خویش نرسانند ویک کودک باز گیرند ہرچہ راندیم و بقلم آورد و بنوشت جملہ بجا آوریم"
نامۂ سلطان سنجر بعظیم الروم از انشائے معین اصم (لباب تعلیقات میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی ص۳۱۷) یہاں بقلم آوردیم و بنوشتیم لایا جاتا۔

یہی اسلوب مثنوی یوسف و زلیخا میں مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ امثال سے

چو فارغ شد از پند و اندرز مرد (۱) بہ بستند پیمان و سوگند خورد (زلیخا ص۱۵)
یہاں بہ بستند کی تبعیت میں سوگند خوردند لایا جاتا۔

نہ سوگند خوردی و پیمان گرفت (۲) گوا بر تن خویش یزدان گرفت (زلیخا ص۱۵)
اس مثال میں گرفتی لایا جاتا۔

گرستند و یک چند زاری نمود (۳) ولیکن گرستن نمی داشت سود (ص۱۵ زلیخا)
اس موقع پر زاری نمودند کہا جاتا۔

سراسر بدان دہ برادر سپرد (۴) ہمہ راہِ کنعان گرفتند و برد (ص۲۰۸ زلیخا)
اس مقام پر بردند آتا۔

میں یہاں اِس قدر اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ اسلوب شاہ نامہ سے مطلق غیر حاضر ہے نہ گرشاسپ نامہ حدیقۂ سنائی اور سکندر نامہ میں پایا جاتا۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تمام ممالک ایران میں اس کا رواج نہیں رہا ہے بلکہ خاص خاص خطّوں میں جن میں ماورالنہر کا نام قابلِ ذکر ہے کیونکہ امثلۂ بالا کے اکثر قائل ماورالنہری ہیں مثلاً محمد عوفی۔ محمد بن علی الکاشانی اور لطیف الدین زکی مراغۂ۔ جوں جوں خروجِ چنگیز خاں کا زمانہ قریب

آتا جاتا ہے یہ اسلوب اور بھی مقبول ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ قرنِ سابع کے ربع اوّل کے مصنفین کے ہاں اس کو ایک ممتاز پایہ مل گیا ہے۔ اور بقول علامہ میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی یہ اسلوب غریبہ لباب الالباب، جوامع الحکایات، تذکرۃ الاولیاء فریدالدین عطار اور المعجم فی معاییر اشعار العجم میں عام طور پر رائج ہے۔

گزشتہ امثال میں اس اسلوب کا ایک پرانا نمونہ معین الدین اصم دیوان انشاے سلطان سنجر کے ہاں ملتا ہے چونکہ یہ سلطان سنجر سلجوقی کا عصر ہے اس لیے اسی دور میں مثنوی یوسف و زلیخاے فردوسی بھی کسی وقت تصنیف ہوئی ہوگی جس کا مصنف بھی غالباً ماوراءالنہری ہوگا۔

صاحبِ زلیخا کی مضمون دزدی

فردوسی کے مضمون دزدوں میں اسدی۔ امیر کیکاؤس۔ سنائی۔ نظامی۔ سعدی۔ خسرو اور جامی کا نام تو سرِ داستان ہی لیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی نامعلوم ہستیاں ایسی ہیں جنھوں نے فردوسی کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا ہے اور جو آج گوشۂ خمول میں بالش نشین ہیں ان میں سے میں اپنے مضمون کے حدود اندازے کو نگاہ رکھتے ہوئے یہاں صرف صاحب زلیخا کی مضمون دزدی کے انکشاف پر قناعت کرتا ہوں۔

مصنفِ یوسف زلیخا ایسا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شاہ نامہ سے بخوبی واقف تھا کیونکہ وہ فردوسی کے مشہور شعروں کی اکثر نقالی یا مقابلے کی کوشش میں مصروف دیکھا جاتا ہے۔ یہ ایک اور غیر مترقبہ تائید ہے ہمارے اس دعوے کی کہ مصنفینِ شاہ نامہ و یوسف زلیخا دو مختلف ہستیاں ہیں کیونکہ فردوسی کی نسبت یہ خیال کرنا کہ زلیخا کے دوران میں وہ اپنے

مشہور اشعار کی ایک مبتذل قسم کی نقالی کرنے لگا تھا بعید از عقل ہوگا۔

ذیل میں چند امثال پر جو بلا مزیدِ تفحص میری معلومات میں آئیں قناعت کی جاتی ہے۔ اگر توجہ سے اور تلاش کی جائے گی تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ فہرست المضاعف ہو جائے گی۔

یوسف زلیخا (طبع طہران)		شاہ نامہ (طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)	
مرا خوشتر آید بزندان درون بزیرِ زنخ دست کردہ ستون	ص۱۳۹	ورا دید با دیدگان پُر زخون بزیرِ زنخ دست کردہ ستون	ص۳۸۱ ج۲
کسے کو گریزد زخورشید و ماہ چگونہ کند سوئے اختر نگاہ	ص۱۴۱	دلِ من چو شد بر ستارہ تباہ چگونہ توان شاد بودن بماہ	ص۳۳ ج۱
چو من بودمی بر سرِ کارِ خویش دلم بستہ بر شغل بازارِ خویش	ص۱۱۴	بدین تندی از من میازار بیش کہ دل بستہ بودم ببازارِ خویش	ص۲۱۴ ج۱
ازیں ہر دو تن راست گفتار کیست وزیں نر و مادہ گنہگار کیست	ص۱۲۵	بہ بینم کزیں دو گنہگار کیست بباد آفرہ بر سزاوار کیست	ص۲۰ ج۱
دعا کن مگر ایزدِ کردگار نشاند مرا کودکے در کنار	ص۱۶۰	و دیگر کہ از تو مگر کردگار نشاند یکے کودکم در کنار	ص۷۶ ج۱
بہر ہفت کشور درون کس نماند کہ او نامۂ نام نیکت نخواند	ص۱۵۷	بگیتی جز از پاک یزدان نماند کہ منشورِ تیغ ترا بر نخواند	ص۱۸ ج۱
کس از سرِّ ایں حکمت آگاہ نیست درین پردہ مخلوق را راہ نیست	ص۱۵۱	ازین رازِ جانِ تو آگاہ نیست درین پردہ اندر ترا راہ نیست	ص۵۵ ج۱
بزیرِ پے پیلتان افگنم بن و بیختان از جہان بر کنم	ص۱۶۳	وگر ہیچ کژّی گمانے برم بزیرِ پے پیلتان بسپرم	ص۲۳ ج۱

به آرامگه شد همه دام و دد
بخفتند هر جانور نیک و بد (ص۱۸۴)

نه آوای مرغ و نه هرای دد
زمانه زبان بسته از نیک و بد (ص۱۵۲ ج۲)

زکشور بکشور سپاهت بود
فلک زیر فرّ کلاهت بود (ص۱۸۸)

ز دریا بدریا سپاه ویست
جهان زیر فرّ کلاه ویست (ص۲۳۳ ج۱)

شب و روز بادت چنیں ارجمند
زچشم بدانت مبادا گزند (ص۱۹۶)

بکامِ تو بادا سپهرِ بلند
زچشمِ بدانت مبادا گزند (ص۷ ج۲)

بدل گفت خورسند گردم برنج
که در رنج باشد سرانجام گنج (ص۱۹۸)

برنج اندر ست ای خردمند گنج
نیابد کسے گنج نابرده رنج (ص۳ ج۱)

از آغاز بنوشت نام خدای
که بوده است و همواره باشد بجای (ص۲۰۳)

سرِ نامه کرد آفرینِ خدای
کجا هست و باشد همیشه بجای (ص۹۵ ج۲)

همی داشتش صد ره از جان فزون
از اندازهٔ مهربانی فزون (ص۲۰۶)

همی داشتم چون یکے تازه سیب
که از باد ناید بمن بر نهیب (ص۳ ج۱)

دگر روز هنگام بانگ خروس
بغرید بر درگهِ شاه کوس (ص۲۱۰)

بشبگیر هنگام بانگ خروس
ز درگاه برخاست آوائے کوس (ص۲۹ ج۲)

ز آئینهٔ پیل و هندی درای
خروش و نوا رفته تا دور جای (ص۱۴۲)

زبس نالهٔ بوق و کوس و درای
همی آسمان اندر آمد زجای (ص۱۴۳ ج۱)

ان امثال سے ناظرین پر یہ بھی روشن ہو سکتا ہے کہ صاحب زلیخا نے فردوسی کی طرز اُڑانے میں ایک بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے لیکن شاہ نامہ اور یوسف زلیخا کا پایۂ نظم کے لحاظ سے کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ جدّت اور معنی آفرینی جوش اور برجستگی جو خدائے سخن کا حصہ ہے زلیخا سے مطلق غیر حاضر ہے۔ مجھ کو کل دو تین شعر زلیخا میں پسند آئے ہ

(۱) زمین زان کند فخر بر آسمان — کہ دارد ز نعل سمندت نشان (ص ۱۹۵)

(۲) بناخن گرہ بافت از مشکناب — در آویخت از گوشۂ آفتاب (ص ۱۲۲)

حدائق البلاغت میں آخری شعر فردوسی کے نام پر ہی نقل کیا ہے۔ نظامی کے ہاں اسی مضمون پر اور ان ہی قوافی میں مجھ کو تین شعر ملے ؎

(۱) نہ گیسو کہ زنجیر از مشکناب — فروہشتہ چوں ابری از آفتاب

(سکندر نامہ برّی ص ۲۷۶ طبع مطبع نامی لکھنؤ ۱۸۹۸ء)

شکن گیر گیسوش از مشکناب (۲) زدہ سایہ بر چشمۂ آفتاب (سکندر نامہ برّی ص ۱۸۶)

کمر بستۂ زلف او مشکناب (۳) کہ زلفش کمر بستہ بر آفتاب (" " ص ۲۳)

سچ تو یہ ہی کہ نظامی کی تینوں کوششیں اس شعر کے مقابلے میں ناکام رہی ہیں۔

ذیل میں کچھ مثالیں اس قسم کی دی جاتی ہیں جن میں فردوسی اور صاحب یوسف زلیخا کو ایک ہی مضمون پر طبع آزمائی کرتے دیکھا جاتا ہی۔ ان مثالوں میں شاہ نامہ سے مقابلے کی خاطر مجھ کو زلیخا سے کچھ اشعار نکال دینا پڑے ہیں اور ایک مقام پر ایک شعر اضافہ کیا ہی۔

یوسف زلیخا	شاہ نامہ
تنِ پاک پیوستہ دارم بتو	من اینک بہ پیشِ تو استادہ ام
دلِ مہربان بستہ دارم بتو	تن و جان شیرین ترا دادہ ام
بہر سان کہ فرماندہی بر سرم	زمن ہر چہ خواہی ہمہ کامِ تو
ترا چون پرستندہ فرماں برم	برآرم نہ پیچم سر از دام تو
پانچ شعر کے بعد	
بگفت این و تنگ اندرون شد برش	سرش تنگ بگرفت و یک بوسہ داد
کہ بوسہ ربایہ زدو شکّرش	ہمانا کہ از شرم نا ورد یاد

چو یوسف چنین دید برپاے جست
ز دستِ زلیخا برون برد دست
که داند که از شرم چون بود چون
که از شرم رخسارِ وے شد چو خون
چنان گشت لرزان ز بیم خداے
ندل ماند با وے نہ دانش نہ راے

(آمدن زلیخا نزدِ یوسف و صحبت داشتن ص ۱۰۹)

از آغاز تا دیده ام چهر تو
گرفتار اندر کفِ مهر تو
نماندست زین پیش آرام دل
همی داد خواهی مرا کام دل
(سه سال ست تا زار و دلخسته ام
ابا آتش و آب پیوسته ام) ص ۱۱۱
گر امروز با من شوی سازگار
درختِ مرادِ من آری ببار
بمه برنهم پایه تختِ ترا
کنم بنده خورشید بختِ ترا
ز شاهان سرت را کنم تاجدار
کمر بسته پیشت جهان بنده وار
اگر سر بتابی ز پیوند من
نیاری دل خویش در بندِ من

رخانِ سیاوش چو خون شد ز شرم
بیاراست مژگان بخوناب گرم
چنین گفت با دل که از کارِ دیو
مرا دور دارا د گیهان خدیو

(رفتن سیاوش بارِ دوم پیش سودابه صفحات ۵-۱۰۴ ج ۱)

که تا من ترا دیده ام مرده ام
خروشان و جوشان و آزرده ام
همی روز روشن نه بینم ز درد
بر آنم که خورشید شد لاجورد
کنون هفت سالست تا مهر من
همی خون چکاند ابر چهر من
یکے شاد کن در نهانی مرا
به بخشاے روز جوانی مرا
فزون زانکه دادت جهاندار شاه
بیارایمت تاج و تخت و کلاه
وگر تو نیائی بفرمانِ من
به پیچی ز رای و ز فرمانِ من

چو دیوانہ زین خانہ تازم برون — کنم بر تو بر پادشاہی تباہ

بہ تیرہ چہ اندر رفتم سرنگون — شود تیرہ بر چشم تو ہور و ماہ

(رفتن زلیخا در آن عمارت و طلب نمودن یوسف و بستن درہا ۱۳۲) (رفتن بیاوش بار سوم پیش سودابہ ص۱۰۵ ج ۱)

من از پشتِ یعقوب پیغمبرم — نژادِ من از پشت گشتاسپ ست

پرستندۂ خالقِ اکبرم — کہ گشتاسپ خود پور لہراسپ ست

سرائیل اللہ جز او کس نبود — کہ لہراسپ بد پور اورند شاہ

زبانِ خرد ہوش او را ستود — کہ او را بدی آن زمان آب و جاہ

چنان دان کہ یعقوب اسحٰق راد — ہم اورند از تخمۂ کی پشین

کہ پیغمبران را ہمہ داد داد — کہ کردی پشین بر پدر آفرین

ذبیح اللہ او بد ز پیغمبران — پشین بود از تخمۂ کیقباد

پسندیدۂ داورِ داوران — خردمند شاہی دلش پر زداد

ہمیدان تو اسحٰق پاکیزہ رائے — ہمی رو چنین تا فریدون شاہ

ز پشتِ خلیلِ ستودہ خدائے — کہ اصلِ کیان بود و زیبائے گاہ

براہیم کش خواند یزدان خلیل — (ستایش کردن اسفندیار پہلوانی و

فرستاد نزدش ہمی جبرئیل ص ۱۵۵ — نژاد خود را در پیش رستم ج ۳ ص ۳۴)

میرا مضمون اپنے آخری مراحل تک پہنچ گیا ہے لیکن اس کو خاتمے تک پہنچانے سے پیشتر چند کلمات دیباچۂ زلیخا کے بیانات کی نسبت کہنے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں میں نے اپنا یہ مضمون لکھا تھا اس وقت ڈاکٹر ایتھے کا مرتب کردہ نسخۂ یوسف زلیخا میرے پاس نہیں تھا جس کا مجھ کو سخت افسوس رہا۔ اس زلیخا میں بسبب تالیف بھی موجود ہے جو بدقسمتی

سے ایرانی اور ہندستانی نسخوں میں موجود نہیں ہیں اس کا خلاصہ ذیل میں پیش کرتا ہوں :-

"یوسف زلیخا کو اس سے قبل دو شاعر نظم کر چکے ہیں پہلا ابوالمؤید بلخی ؎

یکے بوالمؤید کہ از بلخ بود — بدانش ہمی خویشتن را ستود

اس کے بعد بختیاری شاعر نے نظم کیا ؎

پس از وے سخن باف ایں داستان — یکے مرد بد خوب روئے جواں

نہادہ ورا بختیاری لقب — کشادے براشعار ہر جائے لب

نوروز کی تقریب میں بختیاری امیر عراق کے پاس اہواز گیا ؎

خداوند فرخ امیرِ عراق — کہ تختش سپہر است واسپش براق

جہانگیر و قطب دول بحر جاہ — نگہ دار دولت ستونِ سپاہ

ہنرمند سرہنگ با آفرین — سپہ دار سلطان روئے زمین

بادشاہوں کی طرح امیر تخت پر بیٹھا تھا اور باقاعدہ دربار لگ رہا تھا۔ عہدہ دار صف باندھے کھڑے تھے۔ سرود سرا اپنی موسیقی سے حاضرین کو محظوظ کر رہے تھے۔ شعرا علیحدہ صف میں استادہ نظر آتے تھے اور قصیدے سنا رہے تھے۔ بختیاری نے بھی حسب معمول قصیدہ سنایا۔ شعرا کو انعام تقسیم ہوئے اور جلسہ برخاست ہوا۔ ایک روز نوروز کے چند دن بعد کوئی خوش الحان قاری امیر کو سورۂ یوسف سنا رہا تھا۔ امیر کے دل میں اس وقت یہ خیال گزرا کہ اگر یہ سورت فارسی میں اس طرح نظم کردی جائے کہ تفسیر اور مطالب پر حاوی ہونے کے علاوہ شاعری کا بھی حق ادا ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔ وہ یہ خیال کر ہی رہا تھا کہ بختیاری شاعر بھی آنکلا امیر نے اپنا خیال

اس پر ظاہر کیا اور بختیاری نے بڑی مستعدی کے ساتھ اس قصّے کو نظم کر دیا۔ شاعر کہتا ہی اتفاقاً ایک روز میں بختیاری کی زلیخا کا قصّہ تاج زمانہ اجل موفق سے بیان کر رہا تھا[1]

قضارا یکے روز اخبار آں — ہمی راندمش بے غرض بر زباں

بہ نزدیک تاجِ زمانہ اجل — موفق[1] سپہرِ وفا و عمل

---

[1] بقول براون ڈاکٹر ایتھے کا خیال ہی کہ زلیخا فردوسی نے مجد الدولہ ابو طالب رستم ۳۸۷ھ و ۴۲۱ھ کے لیے نظم کی۔ پروفیسر نلدیکی کا اعتقاد ہی کہ بہاؤ الدولہ ۳۸۰ھ و ۴۰۳ھ یا اس کے فرزند سلطان الدولہ ۴۰۳ھ و ۴۲۶ھ کے واسطے لکھی۔ ایتھے کے خیال کی موید کوئی تاریخی دلیل موجود نہیں اس سے اعراض کر کے مَیں نلدیکی کے نظریہ کا ذکر کرتا ہوں جس کی تائید میں یہ باتیں ملتی ہیں۔ موفق بہاؤ الدولہ کا وزیر ہی جس کا پورا نام ابو علی (الحسن بن محمد) بن اسمٰعیل ہی۔ اہواز کو بہاؤ الدولہ کی تاریخ میں زبردست اہمیت بھی حاصل ہی۔ بختیاری شاعر نے جس کا دیباچۂ زلیخا میں ذکر ہی عز الدولہ بختیار ۳۶۷ھ کے نام پر اپنا تخلص رکھا ہوگا جو اس عہد میں بویہ خاندان کا ایک امیر تھا۔

اس نظریہ کے خلاف مَیں اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ الاجلّ تاج الزمان موفّق جس کا دیباچہ میں ذکر ہی اور موفق وزیر بہاؤ الدولہ ایک شخص نہیں ہو سکتے کمال الزمان یا تاج الزمان کی قسم کے القاب پانچویں اور چھٹی صدی میں ملتے ہیں۔ موفق بن اسمٰعیل وزیر بہاؤ الدولہ ۳۹۰ھ میں پہلی مرتبہ اور ۳۹۲ھ میں دوسری مرتبہ گرفتار ہوتا ہی اور عنقریب بعد وفات پاتا ہی۔ یوسف زلیخا کو شاہ نامہ کے اختتام یعنی ۴۰۰ھ کے بعد لکھے جانے کا اعتراف ہی اس عہد سے بہت قبل موفق کا انتقال ہو جاتا ہی۔ زلیخا میں جس موفق کا ذکر ہی وہ کوئی عالم معلوم ہوتا ہی جو صاف الفاظ میں شاعر سے کہتا ہی کہ مَیں تمھاری مثنوی کو وزیر امیرِ عراق کے پاس لے جاؤں گا۔

برم نزدِ دستورِ میرِ عراق — کہ گر دانش خیلند و ایران و شاق

فردوسی ۳۸۸ھ سے ۳۹۴ھ تک غزنین میں موجود ہی اور اس زمانے میں سلطان محمود سے اس کے خوش گوار تعلقات قایم ہیں اس لیے اسی زمانے میں اس کا اہواز جا کر مثنوی یوسف و زلیخا بہاؤ الدولہ کے لیے تصنیف کرنا مستبعد معلوم ہوتا ہی۔

اس ذکر سے میری کوئی خاص غرض نہیں تھی ۔ مگر امام نے مجھ سے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں تم بھی کسی شغل میں لگو اور بہتر تو یہ ہوگا کہ سرمایہ جمع کر کے اِس قصّے کو نظم کر ڈالو لیکن نظم کو دانش سے ترکیب دینا اسقام و خطا سے بری رکھنا تاکہ دوسرے شعرا کو غلطی نکالنے اور اعتراض کرنے کی گنجایش نہ رہے ۔ ترکیب اور بندش چست ہو، معانی اور نکات دل پسند ہوں، اشعار دلچسپ اور بولتے قافیے ہوں، کلام نقص اور گنجلک سے پاک ہو۔ علاوہ بریں دل کش پاکیزہ اور رواں ہو تاکہ میں وزیر امیرِ عراق کے پاس لے جاؤں اور کچھ حصہ اس کے سامنے پڑھا جائے۔ اِس سے تمھاری شاعری کا پایہ اس پر محقق ہو جائے گا اور تھیں یہ فائدہ ہوگا کہ اس کی عنایت تم پر ہو جائے گی ۔ میں نے اِس عالم اجل کی یہ گفتگو سُن کر جواب دیا کہ میں آپ کا تابعدار ہوں، جلد اِس داستان کو نظم کر دوں گا، اگر یہ قصہ عمدہ نظم ہو گیا اور بادشاہ نے پسند فرما لیا، زمانے نے مساعدت کی اور شاہ میری خدمت گزاری سے خوشنود ہو گیا تو شاید اس بہانے سے میری قدر و منزلت میں اضافہ ہو جائے، جس کی وجہ سے میری تشویش و افکار دُور ہو جائیں، اگرچہ میں اپنی نادانی کا اقرار کرتا ہوں لیکن خدا کی رحمت اگر شاملِ حال ہی پادشاہ کا پرتو مجھ پر پڑے گا جس سے مجھ کو ازحد مسرت اور سرخروئی ہوگی۔ میں اپنی لیاقت کے بموجب اس کام میں کوشش کروں گا اور اپنے بوتہ کے موافق نظم کر دوں گا ۔“

اِس بیان کی روشنی میں بغیر کسی تردد کے کہا جا سکتا ہے کہ یہاں ہم فردوسی سے دوچار نہیں ہیں بلکہ کسی اور شاعر سے جو فردوسی سے مختلف

ہو اور جس کی شاعری کی شہرت بھی عام طور پر نامعلوم ہو۔ وزیر عراق سے اس کی تقریب کرانے کے لیے امام موفّق اس کو زلیخا لکھنے کی ترغیب دیتا ہو۔ شاعر اس قدر گمنام ہو کہ وزیر کے دربار تک خود نہیں جا سکتا، اس کی مثنوی امام موفق کی وساطت سے اس تک جائے گی۔ جب امتحاناً تھوڑا سا مثنوی سے وزیر سُن لے گا اور پسند کرے گا تب کہیں غریب شاعر کی قسمت چیتے گی۔ اگر یہ شخص واقعی فردوسی ہو تو اہوازیوں کی اس حماقت کا جواب شاید تاریخ میں کہیں نہ مل سکے کہ شاہ نامہ کے ساٹھ ہزار اشعار پڑھنے کے بعد بھی ان کو فن شعر میں فردوسی طوسی خدائے سخن کا پایہ معلوم نہیں ہوا اس لیے اس کا امتحان لیا جاتا ہو۔ اس کو بختیاری جیسے گمنام شاعر کے مقابلے میں کھڑا کیا جاتا ہو اور کہا جاتا ہو کہ یہاں اگر قدردانی کی امید رکھتے ہو تو اس کی مثنوی کا جواب لکھو لیکن خدارا اس طرح لکھنا کہ دوسرے شاعر انگشت نمائی نہ کریں ؎

مرا گفت خواہم کہ اکنوں تو نیز	بباشی بگفتار و شغلی بہ نیز
ہم از بہر ایں قصہ ساز آوری	ز ہر گوشہ معنی فراز آوری
سخن را بدانش مُرکّب کنی	ز شیب و عوارش مہذّب کنی
بگوئی چناں کاں دگر شاعراں	نیابند زحف و تعدّی در آں
اگر باشدش نظم و ترکیب نغز	معانی پسندیدہ و ہوش و مغز
سخن گاہ دل گیر ہر جایگاہ	قوافیش چوں نامے بر پایگاہ
نہ ناقص نہ غامض نہ یازیدہ سست	حسین و لطیف و روان و درست
برم نزد دستور میر عراق	کہ گردانش خیلند و ایران و شاق
بداں تا گرش رائے باشد یکے	بخوانند نزدیک او اندکے

بداند ترا آں سپہرِ سپاہ | کہ چوں داری اندر سخن دستگاہ
ازو مر ترا ایں کفایت بود | کہ ایں مایہ بہتر عنایت بود

امام اجل کی اس ہدایت پر جو ایک مبتدی شاعر کے لیے زیادہ موزوں ہو سکتی ہی یہ مبینہ فردوسی برا ماننے کے بجائے اُلٹا فخر کرتا ہی اور خوشامد کے لہجہ میں کہتا ہی ؎

چو بشنیدم ایں گفتگوے اجل | دلم راشد اکثر امیدِ اقل
چنیں گفتمش کاے جہان کرم | بجود و نوال و نہاد و نعم
خرد را مدار و سخن را سوار | پناہِ جہاں ز آفتِ روزگار
تن و جان من زیر فرمان تست | رواں در تنِ من ثناخوان تست
بود آں زماں حشمتِ من رہی | کہ بر من بدیں کار فرمان دہی
بخواہی ز من بندۂ مہرباں | یکے آفریں با یکے داستاں
بامر تو ای در جہاں بے نظیر | بگویم من ایں قصۂ دل پذیر
اگر طبع نیکو بہ پیوند دش | اگر شاہ فرزانہ بپسند دش
نگر دست گیرد مرا روزگار | شود شاد ازیں خدمتم شہریار
نگر من رہی یابم از فرِ شاہ | بیابم ز حشمت یکے پایگاہ
ز دل فکرتم پاک بیروں شود | بہ پیراں سرم حشمت افزوں شود
اگر چند در بند نادانیم | بدارد مگر ایزد از زانیم
رساند بر حمت مرا پایۂ | فتد بر سر از خسروم سایۂ
ازیں سایہ من بندۂ مدح گوے | شوم شادمان و بوم سرخروے
بگوشم باندازۂ دست گاہ | کنم بر فزودِ سخن راں نگاہ

ان اشعار نے مجھ کو اپنے قدیم عقیدے میں اور راسخ کر دیا ہی کہ اس تصنیف

کو فردوسی سے کوئی نسبت نہیں ع

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

کہاں فردوسی اور کہاں یہ غریب شاعر لیکن ہم نے بدقسمتی سے شبہ کو گوہر اور ذرّے کو آفتاب مان لیا ہے۔ ان اشعار میں لفظ "اجل" دو موقعوں پر استعمال ہوا ہے اور بحیثیت لقب یاد کیا گیا ہے۔ مجھ کو جہاں تک معلوم ہے فردوسی کے عہد تک اس لقب کا رواج نہیں ہوا ان ایام میں اس کے بجائے لفظ 'جلیل' رائج تھا اور وزرا و امرا کے لیے آتا تھا۔ خاندان بویہ کے بعض وزرا کے لقب میں اُستاد جلیل شامل تھا۔ عضد الدولہ، نوح بن منصور کے وزیر کو "الشیخ الجلیل السید ابی الحسین عبیداللہ بن احمد العتبی" اور تاش حاجب کو "الحاجب الجلیل ابی العباس تاش" خطوں میں لکھتا تھا۔ سلطان مسعود نے اپنے بھائی امیر محمد کا القاب "الامیر الجلیل الاخ" لکھا تھا۔ سلجوقیوں نے اپنے کارناموں کی ابتدا میں معز سوری کو یہ القاب لکھا تھا "ابے حضرت الشیخ الرئیس الجلیل السید مولانا ابی الفضل سوری المعز" (بیہقی صفحہ ۵۸۳) احمد بن عبد الصمد وزیر دوم سلطان مسعود، ابو نصر مشکانی کا القاب یہ لکھا کرتا تھا "الشیخ الجلیل السید ابی نصر بن مشکان" (بیہقی صفحہ ۱۶۴)۔

فرخی امیر یوسف بن ناصر الدین کا نام یوں ذکر کرتا ہے۔ ؎

میر جلیل سید ابو یعقوب ÷ یوسف برادر ملک ایران

اور خواجہ احمد میمندی کے فرزند کا ذکر اس طرح کرتا ہے ؎

بزرگ ہمت ابوالفتح سرفراز تبار ÷ وزیر زادۂ سلطان و برکشیدۂ او

بدو گرفتہ یمین و بدو گرفتہ یسار ÷ جلیل عبدرزاق احمد آں کہ فضل و ہنر

منوچہری ؎

این ہنر خواجہ جلیل چو دریاست   با ہنر بے شمار و گوہر بے حد

یمینی میں سلطان محمود کے وزیر کا نام یوں درج ہے "شیخ الجلیل شمس الکفاۃ ابا القاسم احمد بن حسن المیمندی"۔ تفریحاً کوئی شخص اپنے نام کے ساتھ اس لقب کو رواج نہیں دے سکتا تھا۔ بیہقی میں ایک فقرہ آتا ہے۔

"امیر محمود روزی مرا گفت چرا لقب تو جلیل کردہ اند و تو نہ جلیلی۔ (صفحہ ۸۰۴)

جلیل کا قایم مقام اجل ہے ابتدا میں خالی "اجل" ملتا ہے بعد میں ترکیب پاکر "صدر اجل" "امیر اجل" "شیخ اجل" "امام اجل" بن جاتا ہے۔ بہر حال اس لقب کا رواج سلجوقی دوٗر میں ہوتا ہے پانچویں صدی میں زیادہ تر امرا کے لیے مخصوص ہے۔ چھٹی صدی میں وزرا اور علما کے نام کے ساتھ بھی رائج ہو جاتا ہے اور اکثر ملتا ہے۔ ناصر خسرو ؎

بسے دیدم اعزاز و اجلالہا   زخواجہ جلیل و امیر اجل
ولیکن ندارد مرا ہیچ سوٗد   امیرِ اجل چوں بیاید اجل

ولہ   روا بود کہ امیر اجل تو پشت کنی   اگر امیر اجل از تو باز دارد اجل

حدیقہ میں حکیم سنائی بہرام شاہ غزنوی کے وزیر کا نام یوں ذکر کرتے ہیں "الصاحب الاجل العالم صدر الدین نظام الملک ابی محمد الحسن قاینی" اور نائب وزیر کا نام "الاجل نظام الدین تاج الخواص ابی نصر محمد بن محمد المستوفی"۔ انوری ؎

امیرِ اجل فخرِ دیں بو المفاخر   امیرے بصورت امیرے بمعنی

ولہ   صدر عالی اجل جمال الدین   کہ چو دستِ تو ابر و جیحوں نہ

ولہ   اگر برنج ندارد اجل نجیب الدین   کہ ہیچ رنج مبادش ز عالمِ بکنش

۸۲۹ھ میں شاہزادۂ بایسنغر میرزا کے حکم سے شاہ نامہ کا ایک نیا
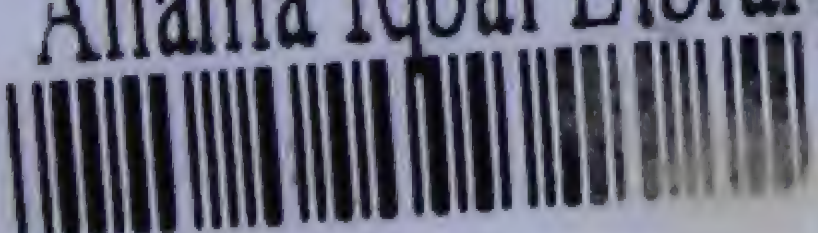
ایڈیشن تیار ہوتا ہے۔ اس کے دیباچے میں سب سے پہلے مثنوی یوسف زلیخا کا تفصیلی مذکور آتا ہے کہ جب فردوسی سلطان محمود کے خوف سے بغداد میں جاکر پناہ گزیں ہوتا ہے تو چونکہ خلیفہ اور اہالی بغداد شاہ نامہ کو بوجہ مدح ملوک عجم پسند نہیں کر سکتے تھے اس لیے اُس نے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے خیال سے کتاب یوسف و زلیخا نظم کی، یہ مثنوی عام طور پر بہت پسند کی گئی اور دربار خلافت میں اس سے فردوسی کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوُا۔ (دیباچۂ بایسنغر خانی ص۱۳)

بغداد میں فردوسی کا قیام جو ایک غیر تاریخی واقعہ ہے ایک تاریخی قصّے کے انضمام سے پایۂ ثبوت کو پہنچایا گیا ہے۔ وہ قصہ دیباچۂ بایسنغری میں اس طرح درج ہے کہ جب فردوسی کے قیام کی اطلاع سلطان محمود غزنوی کے گوش گزار ہوئی تو اس نے فردوسی کی طلبی کی امید میں ایک مکتوب بارگاہِ خلافت میں روانہ کیا جس میں علاوہ اور شررفشانیوں کے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر امیرالمومنین نے فردوسی کو میرے پاس روانہ نہ کیا تو میں بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا اور دارالخلافہ کی خاک ہاتھیوں پر بار کرواکر غزنیں لے آؤں گا۔ مستقل مزاج خلیفہ القادر باللہ سلطانی تہدید سے مطلق مرعوب نہ ہوُا۔ اس نے جواب میں صرف ایک لفظ "الم" لکھ کر بھیجا۔ محمود کے دبیر خلیفہ کے اس مختصر جواب کی عقدہ کشائی سے عاجز رہے۔ انجام کار بڑے غور و خوض تلاش و تجسس کے بعد سب نے یہ رائے قائم کی کہ چونکہ سلطان نے اپنے خط میں خلیفہ کو خاک بغداد کی نسبت ہاتھیوں سے تہدید کی تھی۔ اس لیے جواب میں خلیفہ نے سورۃ الفیل کی طرف تلمیح کی ہے کہ

"الم ترکیف فعل ربک باصحاب الفیل"۔ سلطان اس جواب سے بہت خوش ہئوا۔

بیں اس واقعہ کی اصلیت پر کوئی اشتباہ پیدا کرنا نہیں چاہتا اس کا ذکر اکثر تاریخوں میں ملتا ہی۔ اور سب سے پہلی تاریخ جس میں اس کا ذکر ہی اور میری نگاہ سے گزری ہی تاریخ گزیدہ ہی جو آٹھویں صدی کی ربع اوّل کی یادگار ہی تاریخ گزیدہ اور نگارستان میں بنائے مخاصمت سلطان اور خلیفہ کے مابین بالتصریح فردوسی بتایا گیا ہی لیکن ان تاریخوں کے باوجود وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہی کہ واقع میں فردوسی کا اس قصّے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ حقیقت نفس الامر یہ ہی کہ امر متنازعہ فیہ سلطان اور خلیفہ کے درمیان ملک ماوراءالنہر تھا۔ سلطان خواہش مند تھا کہ ملک ترکستان پر متصرف ہو اور خلیفہ مانع تھا جب سلطان نے دیکھا کہ عجز و لجاج سے کار برآری دشوار ہی تو ضرورتاً تشدّد کا لہجہ اختیار کیا جس کے جواب میں خلیفہ نے وہ مشہور لفظ "الم" لکھا۔ میرے بیان کا سب سے قوی اور بہتر ثبوت کتاب قابوس نامہ ہی جو فارسی نثر میں پانچویں صدی ہجری کے ربع سوم کی ایک شاندار اور وقیع یادگار مانی جا سکتی ہی۔ اس کے مصنف امیر عنصر المعالی کیکاؤس والی طبرستان نے بعض تاریخی واقعے جو خود اس کی سرگزشت یا اس کے قریب زمانوں کے واقعات سے تعلق رکھتے ہیں اس کتاب میں درج کیے ہیں۔ انہی قصّوں میں اتفاقیہ سلطان محمود اور خلیفہ القادر باللہ کا واقعہ بھی لکھا گیا ہی۔ یہاں (باب سی و نہم در آئین کاتب ص ۱۸۵ و ص ۱۸۷) ہم صاف دیکھتے ہیں کہ سلطان اور خلیفہ کے

مابین بنائے مخاصمت حقیقت میں ملک ماوراءالنہر تھا نہ فردوسی۔ قابوس نامہ میں یہ تمام واقعات برخلاف دیباچۂ بایسنغر خانی کے نہایت تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ (تاریخ روضۃ الصفا میں انہی بیانات کی تائید کی گئی ہے)۔ قابوس نامہ سلطان محمود غزنوی کے صرف ترپّن سال بعد تصنیف ہوا ہے اور اس واقعہ کے لیے اس کتاب سے بہتر کوئی قدیم اور معتبر شہادت فی زمانہ دستیاب نہیں ہو سکتی، باوجود ایسی معتبر شہادت کے اس قصّہ کا انضمام فردوسی کے نام کے ساتھ ان قرون کی فردوسی پرستی کے تصوّر سے سمجھ لیا جا سکتا ہے اور بس۔
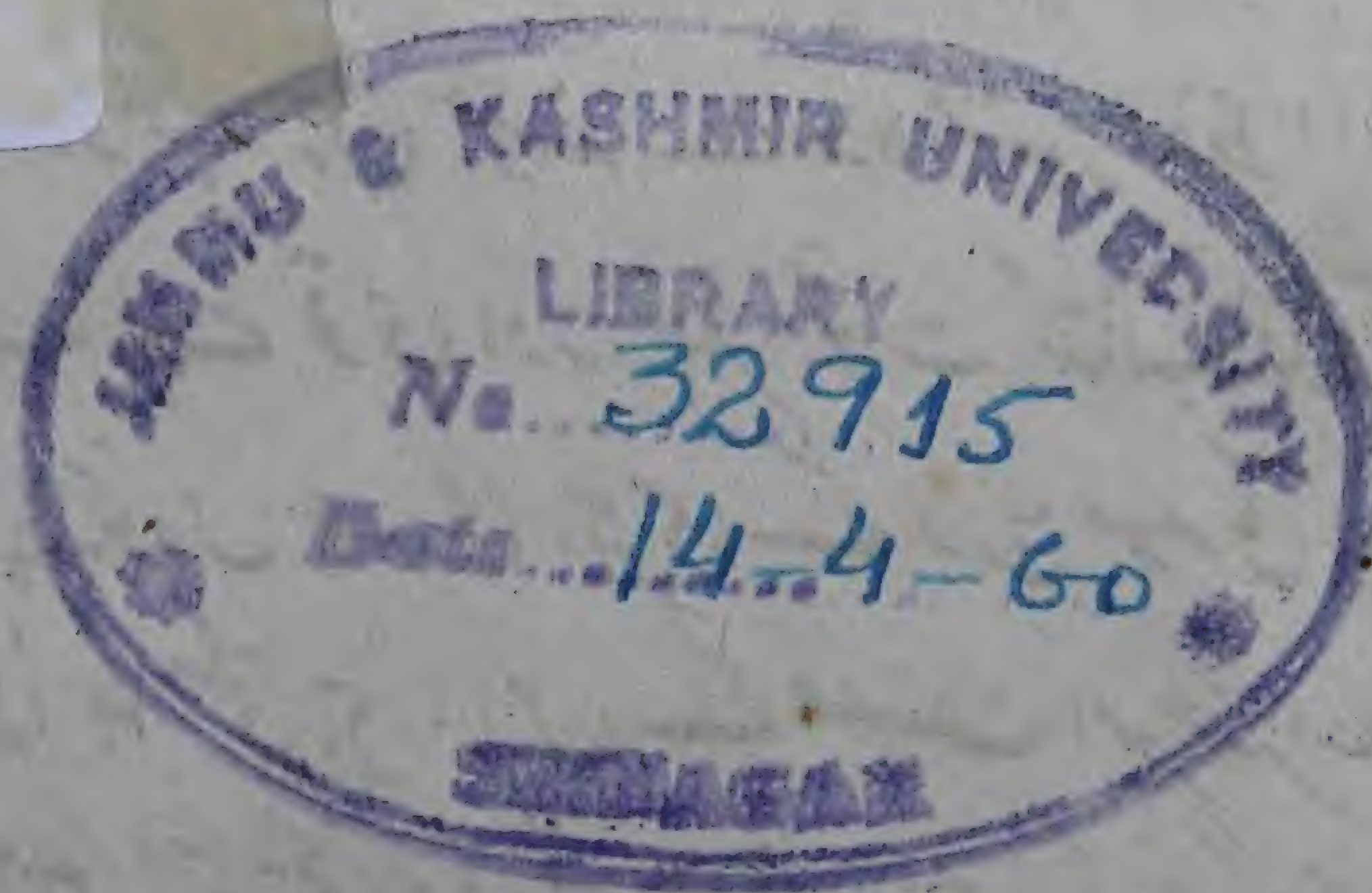
مفید عام پریس لاہور میں باہتمام لالہ موتی رام منیجر چھپی۔
اور سیّد صلاح الدین جمالی منیجر انجمن ترقّی اردو (ہند) نے دہلی سے شائع کی۔

عام پسند سلسلہ

اُردو زبان کی اشاعت و ترقی کے لیے بہت دنوں سے یہ ضروری خیال کیا جا رہا تھا کہ سلیس عبارت میں مفید اور دلچسپ کتابیں مختصر حجم اور کم قیمت کی بڑی تعداد میں شایع کی جائیں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے اسی ضرورت کے تحت عام پسند سلسلہ شروع کیا ہے اور اس سلسلے کی پہلی کتاب ہماری قومی زبان ہے جو اُردو کے ایک بڑے محسن اور انجمن ترقی اُردو (ہند) کے صدر جناب ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کی چند تقریروں اور تحریروں پر مشتمل ہے۔ امید ہے کہ یہ سلسلہ واقعی عام پسند ثابت ہوگا اور اُردو کی ایک بڑی ضرورت پوری ہو کر رہے گی۔ قیمت ۸ر

ہمارا رسم الخط

از جناب عبد القدوس صاحب ہاشمی

رسم الخط پر علمی بحث کی گئی اور تحقیق و دلیل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے کہ ہندستان کی مشترکہ تہذیب کے لیے اُردو رسم الخط مناسب ترین اور ضروری ہے۔

گیارہ پیسے کے ٹکٹ بھیج کر طلب کیجیے۔

منیجر انجمن ترقی اُردو (ہند) ۱۰ دریا گنج دہلی